تدبّر

زیرِ نگرانی

مولانا امین احسن اصلاحی

یکے از مطبوعات

ادارہ تدبّر قرآن وحدیث

تدبر

سلسلہ نمبر ۱۵ محرم الحرام ۱۴۰۶ھ ستمبر ۱۹۸۵ء

فہرستِ مضامین

تذکرہ وتبصرہ

ادارہ کے پانچ سال ۔۔۔۔۔ خالد مسعود ۳

تدبر قرآن

تفسیر سورۂ آلِ عمران (۴) ۔۔۔۔۔ خالد مسعود ۸

اصول تدبر حدیث

حدیث کے غث وسمین میں امتیاز کے لیے اساسی کسوٹیاں
۔۔۔۔۔ امین احسن اصلاحی / ماجد خاور ۱۲

تدبر حدیث

مماثل کردار کی یکساں سزا ۔۔۔۔۔ خالد مسعود ۲۵

تزکیۂ نفس

آدمی کا تعلق
اپنے کنبہ اور بیوی بچوں کے ساتھ ۔۔۔۔۔ امین احسن اصلاحی ۳۳

مراسلہ ومذاکرہ

قوم کے عروج وزوال میں کردار کی اہمیت ۔۔۔۔۔ امین احسن اصلاحی / خالد مسعود ۴۵

مجلسِ ترتیب :

- خالد مسعود (مدیر)
- عبد اللہ غلام احمد
- ماجد خاور
- محبوب سبحانی

ناشر : ادارہ تدبرِ قرآن وحدیث
رحمان سٹریٹ، مسلم کالونی، سمن آباد، لاہور - ۲۵
مطبع : المطبعة العربية - لاہور

قیمت : ۴/- روپے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تذکرہ وتبصرہ

خالد مسعود

ادارہ کے پانچ سال

ادارہ تدبر قرآن وحدیث یکم محرم ۱۴۰۱ھ کو معرضِ وجود میں آیا تھا۔ اس طرح اس کے قیام پر پورے پانچ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے قارئین کو یہ بتائیں کہ اس عرصہ میں ادارہ کے مقاصد کس حد تک حاصل ہوئے۔ پیش نظر کام کی اہمیت کیا ہے اور اس راہ کی مشکلات کیا ہیں۔

ادارہ کا قیام مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ، کے اس عزم کا مرہونِ منت ہے کہ تفسیر 'تدبر قرآن' کی تکمیل کے بعد وہ حدیث کی خدمت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیں گے۔ ابتداءً تو مولانا کے پیش نظر یہ بات رہی کہ وہ صحاح میں سے کسی ایک کتاب کی شرح لکھیں جس میں بنائے اعتماد کتاب کا نام یا مجرد حدیث کی سند نہ ہو بلکہ تحقیقِ حدیث کے فطری اصول مدنظر رکھے جائیں اور ہر روایت کے الفاظ، موقع ومحل، سیاق وسباق، نظائر وشواہد اور قرآن مجید کے ساتھ اس کی موافقت یا عدم موافقت جیسے پہلو سے اس پر غور کیا جائے۔ لیکن 'تدبر قرآن' کی تکمیل پر ۲۳ برس کی طویل مدت صرف ہوئی اور مولانا اس سے جب فارغ ہوئے تو وہ عمر کے اس حصہ میں پہنچ چکے تھے جب آدمی کسی نئے محنت طلب کام کے لیے اپنے اندر طاقت محسوس نہیں کرتا۔ مولانا کے اپنے الفاظ میں "یہ کام تدبر قرآن کے کام سے کچھ کم مشکل نہیں ہے۔ اس کو حسن وخوبی سے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے حدیث، رجال، اصولِ حدیث اور اصولِ فقہ کے ہزاروں صفحے پڑھنے ہوں گے اور اس سے کہیں زیادہ قرآن اور عقل ونقل سے اس کی موافقت معلوم کرنے پر غور وتدبر کی ضرورت ہوگی۔ یہ موضوع نسبتاً حساس بھی زیادہ ہے اس وجہ سے جب تک پوری تیاری کے ساتھ کوئی ایسی چیز نہیں پیش کی جائے گی جو لوگوں کو قائل کر دینے والی ہو تو اندیشہ ہے کہ وہ مفید ہونے کے بجائے مضر ہوگی۔ ان وجوہ سے میں اپنے اندر تو یہ ہمت نہیں پا رہا ہوں کہ اس بارِ عظیم کو اٹھاؤں لیکن اس کام کی اہمیت کا مجھے پورا احساس ہے۔ اس وجہ سے میں نے اپنے آپ کو اس بات

پرآمادہ کرلیا ہے کہ اگر کچھ نئی صلاحیتیں اس خدمت کے لیے آمادہ ہو جائیں گی تو میں اپنے علم و استطاعت کی حد تک ان کی مدد کرنے کی کوشش کروں گا۔"

مولانا کے اس عزم کو دیکھ کر کچھ لوگ جمع ہوئے اور مولانا سے علمی استفادہ اور تربیت حاصل کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ اس طرح ادارہ تدبر قرآن و حدیث وجود میں آگیا۔ رفقائے کار کے میسر آجانے کے بعد مولانا مدظلہ نے قرآن اور حدیث پر غور و تدبر کے اصول کی نشان دہی اور وضاحت کے لیے لیکچرز کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ ان میں انھوں نے رائج تصورات پر تنقید کی اور معروضی طور پر اس راہ کے مسائل کا جائزہ لیا اور مثبت حل پیش کیا۔ ان اصولی مباحث کے بعد مولانا نے قرآن مجید کا ہفتہ وار تحقیقی درس، نیز حدیث کی تعلیم کے لیے موطا امام مالکؒ کی تدریس شروع کی۔ ان پانچ سالوں میں قرآن مجید کے بارہ پاروں اور نصف سے زیادہ موطا کا درس مکمل ہو چکا ہے، جس میں مولانا نے کسی خاص فقہی مسلک سے ہم آہنگی کے بجائے انھی اصولوں کو مدنظر رکھا جو انھوں نے اپنے لیکچرز میں واضح کیے تھے۔ اس ضمن میں مولانا کی جو رائے ہے وہ ان کے اپنے الفاظ میں یہ ہے کہ:

"قرآن مجید پر غور کرنے کا جو صحیح طریقہ ہے وہ میں نے تدبر قرآن میں واضح کر دیا ہے اور پورے قرآن کی تفسیر کر کے یہ دکھا بھی دیا ہے کہ اگر یہ راہ اختیار کی جائے تو وہ تمام اختلافات آپ سے آپ رفع ہو جاتے ہیں جو محض قرآن کا صحیح علم نہ ہونے کے سبب سے پیدا ہو گئے ہیں۔ میرے نزدیک حدیث پر غور کرنے کے طریقے میں بھی بنیادی اصلاح کی ضرورت ہے۔ اس وقت حدیث کی تعلیم ہر مکتب فکر کے علما اپنے اپنے تقیدات کے تحت دے رہے ہیں۔ کلام و عقائد اور فقہیات میں جس گروہ کا جو مسلک ہے وہ کوشش کرتا ہے کہ قرآن و حدیث دونوں سے وہ اپنی تائید حاصل کرے، اگرچہ اس کے لیے اسے کتنا ہی ظلم کرنا پڑے۔"

اس علمی سرمائے کو کیسٹوں میں محفوظ کیا گیا اور اسے دوسرے اہل علم تک منتقل کرنے کے لیے رسالہ 'تدبر' کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ اس کے ۱۵ شماروں میں اصولی مباحث کے تمام لیکچرز مرتب کر کے شائع کیے جا چکے ہیں۔ مولانا کے دروس کی روشنی میں موطا کی شرح کی تدوین اس وقت ادارہ کے پیش نظر ہے۔ حکمت قرآن کو واضح کرنا بھی ادارہ کے مقاصد میں ہے۔ اس ضمن میں مولانا مدظلہ نے جدید و قدیم فلسفیانہ نقطہ ہائے نظر پر تنقید اور ان کے بارے میں قرآن و سنت کے نقطہ نظر کی خالص علمی سطح پر وضاحت کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ اس سلسلہ کے تین اہم موضوعات 'تدبر' میں زیر بحث آچکے ہیں اور باقی زیر ترتیب ہیں۔ اس سلسلہ مضامین کی مدد سے ان شاء اللہ قرآنی علم کلام اور اسلامی فلسفہ کی تشکیل جدید کی راہ کھلے گی

اسی حکمت قرآن کو وہ مختصر مضامین بھی واضح کرتے ہیں جو سوالوں کے جوابات کی صورت میں شائع کیے جاتے ہیں۔

رسالہ میں تدبر قرآن کے عنوان کے تحت جو تفسیری حواشی شائع ہو رہے ہیں وہ مولانا مدظلہ کی عظیم تفسیر 'تدبر قرآن' سے ماخوذ ہیں۔ ہمارے بعض قارئین نے اس سلسلہ کو بہت مفید قرار دیا ہے اور مطالبہ کیا ہے کہ مرتب اس کو رسالہ کے چھپنے کی رفتار سے نہیں بلکہ الگ منصوبہ بنا کر جلد از جلد لکھیں اور کتابی صورت میں لائیں۔ لیکن ان حواشی کے بارے میں یہ رائے بھی سامنے آئی ہے کہ سہل پسند طبیعتیں انھی پر اکتفا کریں گی اور تفسیر تدبر قرآن کے بحر ذخار میں غواصی پر آمادہ نہیں ہوں گی لہٰذا مرتب کو حاشیہ لکھ کر اصل تفسیر سے بے اعتنائی کا کوئی موقع فراہم نہیں کرنا چاہیے۔ یہ سلسلہ شروع کیا گیا تو اس وقت پیش نظر مقصد یہ تھا کہ لوگ اس حاشیہ سے مولانا کے فکر قرآنی سے مجمل واقفیت حاصل کر سکیں گے اور یہ ان کے اندر اس بات کا اشتیاق پیدا کرے گا کہ وہ اصل تفسیر کی طرف رجوع کریں اور اس کے ساتھ ان میں ذہنی مناسبت پیدا ہو چکی ہو۔ امید ہے ہمارے قارئین ان دو متضاد رایوں کے بارے میں اپنے نقطہ نظر سے ہمیں آگاہ فرمائیں گے تاکہ مرتب اس سلسلہ کے بارے میں یکسو ہو کر کوئی فیصلہ کر سکے۔

'تدبر حدیث' کے عنوان سے اب تک صحیح مسلم کی گیارہ روایتوں کی وضاحت رسالہ میں شائع کی گئی ہے۔ اس میں تحقیق حدیث کے انھی اصولوں کو مدنظر رکھا گیا ہے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا۔ روایت کے الفاظ، موقع و محل، نظائر و شواہد اور قرآن مجید کے ساتھ ان کی موافقت یا عدم موافقت کے پہلو سے کی گئی اس تحقیق کو قارئین نے عام طور پر ایک منفرد اور مفید اسلوب وضاحت قرار دیا ہے۔

'تدبر' کے ان شماروں میں مولانا مدظلہ نے اپنی مقبول تصنیف —— تزکیۂ نفس —— کی ایک اور جلد بھی مکمل کر لی ہے۔

جہاں تک رسالہ کے ظاہری و معنوی حسن اور اس کے معیار تحقیق کا تعلق ہے ہمیں تحسین کے بے شمار خطوط موصول ہوئے ہیں۔ اخباری تبصروں میں بھی اس کے انداز کو بالعموم نہایت علمی و عقلی، مدلل اور دلنشین قرار دیا گیا ہے۔ قارئین کو اگر شکایت ہے تو اس بات سے کہ یہ سہ ماہی مجلہ کی حیثیت سے کیوں شائع ہوتا ہے؛ اسے ماہنامہ کے طور پر کیوں شائع نہیں کیا جاتا۔ اس ضمن میں جو رکاوٹیں حائل ہیں ان کی طرف ہم ایک گزشتہ اشاعت میں اشارہ کر چکے ہیں۔

فی الجملہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ادارہ نے ان پانچ برسوں میں نہ صرف قرآن اور حدیث پر فکر و تدبر کے زیادہ دل نشین اور فطری اصولوں کا تعین کیا بلکہ قرآن و حدیث پر تحقیق کے کام میں بھی خاص پیش رفت کی۔ نیز حکمت قرآن، اسلامی فلسفہ اور علم کلام کے ضمن میں نئے نشان راہ متعین کیے جن کی مدد سے آگے زیادہ دقیق اور

جامع کام ہونا ممکن ہو سکے گا۔

قارئین سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ مولانا محترم اپنے استاذِ گرامی مولانا حمیدالدین فراہیؒ کے فکر کے حامل اور ان کے علمی ورثہ کے امین ہیں۔ اس فکر کو منقح شکل میں پیش کرنے کے سلسلہ میں ان کی خدمات بڑی بیش قیمت ہیں۔ یہ فکر اپنے اندر بڑی صلاحیتیں رکھتا ہے۔ جن میں سے چند نمایاں باتوں کی طرف ہم یہاں توجہ دلائیں گے۔

اولاً، ہر دور کے مستشرقین کا محبوب مشغلہ یہ رہا ہے کہ وہ قرآن کو ایک بے ربط اور وحدتِ فکر سے عاری تصنیف قرار دیں۔ وہ اپنے طور پر اس کی ترتیب کو زیادہ مربوط اور بامقصد بنانے کی کاوشیں کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے قرآن مجید کے بعض نسخے سورتوں کی ترتیب کو الٹ پلٹ کر شائع کیے اور یہ دعویٰ کیا کہ اس ترتیب پر قرآن کی تدوین زیادہ سائنٹیفک ہے۔ مستشرقین کی طرف سے قرآن پر اس الزام کے جواب میں ہم یہ ثابت کرتے رہے ہے کہ قرآن کی یہ ترتیب اللہ کے حکم کے تحت ہوئی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کر اب تک امتِ مسلمہ نے اس کو محفوظ رکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جواب مسلمانوں کو تو قائل کر سکتا تھا لیکن مخالفینِ اسلام نے اس کو کوئی اہمیت نہ دی۔ انہوں نے اپنی لے اس قدر بڑھائی کہ مسلمانوں کے بعض طبقے بھی ان کی ہمنوائی کرنے لگے۔ فکرِ فراہی میں قرآن مجید پر اس اعتراض کا نہایت مسکت جواب ہے۔ تفسیر 'تدبرِ قرآن' نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ قرآن معنوی لحاظ سے انتہائی مربوط کتاب ہے۔ اس کا نظم انتہائی سائنٹیفک اور بامقصد ہے۔ اس میں ایک شوشے کا الٹ پھیر بھی اس کے نظم کے حسن کو غارت کر سکتا ہے؛ لہٰذا ترتیبِ قرآنی کو بدلنے کے مشورے محض بدنیتی اور اسلام دشمنی پر مبنی ہیں۔

ثانیاً، یہ فکر ہر موضوع پر قرآن مجید کی حکمت کا استخراج کرنے کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہے۔ اگر اس نہج پر محنت کی جائے تو عصری عمرانی علوم کے بارے میں یہ تحقیق ممکن ہے کہ ان علوم کے کون سے حصے قرآنی فکر سے مطابقت نہیں رکھتے اور ان میں اسلامی نقطۂ نظر کیا ہونا چاہیے۔ خود مولانا فراہیؒ نے اس نہج پر کام شروع کر دیا تھا لیکن ان کی عمر نے وفا نہ کی اور یہ ناتمام رہ گیا۔

ثالثاً، اس فکر میں یہ صلاحیت ہے کہ فرقوں میں بٹی ہوئی امت کو اس حبلِ متین کی طرف رہنمائی کرے جس کو پکڑ کر یہ امت متحد اور اس کے باہمی اختلافات ختم ہو سکتے ہیں۔ اس فکر نے قرآن و سنت دونوں کی تحقیق کا ایک ایسا طریق کار وضع کیا ہے کہ اگر تعصبات کو راہ نہ دی جائے تو ہر مسلمان یکساں شرحِ صدر اور اطمینانِ قلب کے ساتھ ان کے حقیقی علم سے فیض یاب ہو سکتا اور اختلافات کی خلیج پاٹی جا سکتی ہے۔

رابعاً، یہ فکر انتہائی متوازن ہے۔ اس میں نہ تو ان لوگوں کی بے اعتدالی پائی جاتی ہے جو ابھی تک صدیوں پرانے معیارِ فہم و تحقیق کو حرزِ جان بنائے ہوئے ہیں اور دین سے عقل کو بے دخل کرنے پر تلے رہتے ہیں۔ اور نہ ان لوگوں کی آزاد خیالی اور بے راہ روی ہے جو تلی ورثہ علمی کے بارے میں احساس کمتری میں مبتلا ہیں اور ہر مسئلہ میں ان کے نزدیک رائے وہی صائب ہے جو اہلِ مغرب نے پیش کی ہو۔ گویا اس فکر میں وہ قدامت ہے جو دانش سے عاری نہیں اور وہ جدت ہے جس میں کجبحث قسم کی آزاد روی نہیں۔

اپنی ان خصوصیات کی بدولت اس فکر نے نہ صرف برصغیر پاک و ہند میں بلکہ بیرونِ ملک بھی اہلِ علم کی توجہ اپنی طرف مبذول کی ہے۔ جامعہ قاہرہ اور یونیورسٹی آف مشی گن (امریکہ) فکرِ فراہیؒ اور نظمِ قرآن کے موضوعات پر کام کرنے والوں کو ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں دے چکی ہیں۔ افسوس کہ ہماری یونیورسٹیوں کے فاضل اساتذہ کو ابھی اس فکر پر کام کرنے کا خیال نہیں آیا۔

فکرِ فراہی کی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے لیے ایک وسیع الاطراف پروگرام کی ضرورت ہے۔ نظمِ قرآن کے رموز مزید تحقیق کے طالب ہیں۔ حکمتِ قرآن کو تمام اہم عنوانات کے تحت مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ قرآن مجید کی روشنی میں عصری عمرانی علوم کا جائزہ اور تدوینِ نو اپنی جگہ ایک مستقل کام ہے۔ مولانا فراہیؒ کے ناتمام مسودات دعوتِ عمل دے رہے ہیں کہ کوئی ان کو مرتب کرکے ان کے ناتمام مباحث کو مکمل کرے اور ان کو اہلِ علم کی رہنمائی کے لیے شائع کیا جائے۔ یہ تمام کام اس امر کے متقاضی ہیں کہ ادارہ کو وسعت دی جائے۔ اب تک جو کچھ ہوا یہ مصروف رفقائے کار کے ہاتھوں ادارہ کے کسی مستقل ذریعۂ آمدنی کے بغیر ہوا۔ رفتارِ کار کو تیز کرنے کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ادارہ کا ایک ٹرسٹ ہو جو اس کے لیے مستقل ذریعۂ آمدنی فراہم کرے اور مولانا مدظلہ نے جن لوگوں پر محنت صرف کی ہے ان میں سے دو تین افراد بطور ریسرچ فیلو مولانا کی زیرِ نگرانی ہمہ وقتی کام کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ منصوبہ بڑا سرمایہ چاہتا ہے۔ اگر کچھ اہلِ ثروت کام کو وسعت دینے کے لیے مالی اعانت پر آمادہ ہو جائیں تو وہ اہم دینی خدمت سرانجام دے سکتے ہیں جس کے نتائج سے ان شاء اللہ پوری امتِ مسلمہ بہرہ مند ہوگی۔ ہم امید رکھتے ہیں کہ رسالہ کے قارئین اور ادارہ کے کرم فرما اس نہج پر منصوبہ بندی کے لیے ہمیں اپنے مشوروں اور عملی تعاون سے نوازیں گے اور اپنے اپنے دائرے میں اہلِ ثروت کو بھی اس جانب متوجہ فرمائیں گے۔ باقی کامیابی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

خالد مسعود

تفسیر سورۂ آل عمران (۴)

تم خدا کی وفاداری کا درجہ ہرگز نہیں حاصل کر سکتے جب تک ان چیزوں میں سے خرچ نہ کرو جن کو تم محبوب رکھتے ہو۹۰ اور جو کوئی چیز بھی تم خرچ کرو گے، تو اللہ اس سے باخبر ہے۔ ۹۲

کھانے کی ساری چیزیں بنی اسرائیل کے لیے حلال تھیں، مگر وہ جو اسرائیل نے تورات کے نازل کیے جانے سے پہلے اوپر حرام ٹھہرالی تھیں۔ کہہ دو لاؤ تورات اور اس کو پڑھو اگر تم سچے ہو۹۱۔ جو لوگ اس کے بعد بھی اللہ پر جھوٹ باندھیں وہی لوگ ظالم ہیں۔ ۹۴

کہہ دو اللہ نے سچ فرمایا تو ابراہیم کی ملت کی پیروی کرو جو حنیف تھا اور مشرکین میں سے نہ تھا۔ بے شک پہلا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا گیا وہی ہے جو مکہ میں ہے۔ عالم والوں کے لیے برکت اور ہدایت کا مرکز۹۲۔ وہاں واضح نشانیاں ہیں۔ مسکنِ ابراہیم ہے جو اس میں داخل ہو جائے وہ مامون ہے۔ اور جو لوگ وہاں تک پہنچنے کی استطاعت

---

۹۰ بنی اسرائیل محض چند رسوم کی ظاہر دارانہ پیروی کر کے یہ سمجھتے تھے کہ خدا کی وفاداری میں جو مرتبہ و مقام ان کا ہے وہ کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔ فرمایا کہ خدا کی وفاداری کا مقام مجرد دعویٰ یا جھوٹی رسم داری سے حاصل نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے لئے قربانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ (بقرہ ۱۷۷)

۹۱ یہود مدعی تھے کہ ملت ابراہیم پر وہ ہیں نہ کہ مسلمان۔ اس دعوے کے ثبوت میں وہ کہتے ہیں کہ ملت ابراہیم کی حرام چیزوں مثلاً اونٹ کے گوشت کو یہ جائز سمجھتے ہیں۔ یہ اس کا جواب دیا ہے کہ یہود نے حضرت اسرائیل (یعنی یعقوب) کی اتباع میں اس گوشت کو حرام ٹھہرا لیا حالانکہ وہ ذاتی طور پر اسے استعمال نہ کرتے تھے۔ ملت ابراہیم میں اس گوشت کے حرام ہونے کا کوئی ثبوت تورات سے پیش نہیں کیا جا سکتا۔

۹۲ یہ اصل مرکزِ ابراہیمی کا پتا دیا ہے کہ وہ بیت اللہ تھا نہ کہ بیت المقدس۔ یہود نے کتابوں میں تحریف کر کے

رکھتے ہیں ان کے اوپر اس گھر کا حج ہے۔ اور جس نے کفر کیا تو اللہ عالم والوں سے بے پروا ہے۔ ۹۷

پوچھو اے اہل کتاب تم اللہ کی آیتوں کا کیوں انکار کرتے ہو۔ درآنحالیکہ جو کچھ تم کہہ کر رہے ہو سب خدا کی نظر میں ہے۔ کہو اے اہل کتاب تم ایمان لانے والوں کو اللہ کی راہ سے کیوں روک رہے ہو، تم اس میں کجی پیدا کرنی چاہتے ہو حالانکہ تم گواہ بنائے گئے ہو۹۳۔ جو کچھ تم کر رہے ہو، اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے۔ ۹۹

اے ایمان والو۹۴! اگر تم اہل کتاب کے ایک گروہ کی بات مان لو گے تو یہ تم کو تمہارے ایمان کے بعد پھر کفر کی طرف پلٹ دیں گے۔ اور تمہارا کفر میں پڑنا کس طرح جائز ہے جب کہ تم کو اللہ کی آیات سنائی جا رہی ہیں اور تمہارے اندر اس کا رسول موجود ہے اور جو اللہ کو مضبوطی سے پکڑے گا۹۵ تو وہی ہے جس کو صراطِ مستقیم کی ہدایت ملی۔ ۱۰۱

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور نہ مرو تم مگر اس حال میں کہ تم اسلام۹۶ پر ہو۔ اور اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی۹۷ سے پکڑو، اور پراگندہ نہ ہو اور اپنے اوپر اللہ کے اس

مکہ سے حضرت ابراہیمؑ کے تعلق کے شواہد مٹانے کی کوشش کی حالانکہ اس کے مرکزِ ابراہیمی ہونے کے ناقابل تردید شواہد اس سرزمین میں اب بھی موجود ہیں۔

۹۳ یہ اہل کتاب کو زجر و ملامت ہے کہ تم نے شہداء اللہ ہو کر رہزنوں کا پیشہ اختیار کر لیا ہے۔ یاد رکھو تمہاری اس حرکت سے اللہ تعالیٰ بے خبر نہیں ہے۔

۹۴ اب یہ اس طریقے کی طرف رہنمائی فرمائی ہے جس کو اختیار کر کے مسلمان ان فتنوں سے اپنے آپ کو بچا سکتے تھے جو اہل کتاب ان کو گمراہ کرنے کے لیے ابھار رہے تھے۔ ساتھ ہی اس اجتماعی نظام کی طرف بھی رہنمائی فرما دی، جو امتِ مسلمہ کو صراطِ مستقیم پر قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے۔

۹۵ اللہ کو مضبوطی سے پکڑنے کے معنی اس کے احکام و ہدایات اور اس کی کتاب پر مضبوطی سے نرم و گرم ہر طرح کے حالات میں، مخالفت و موافقت سے بے نیاز ہو کر قائم رہنا ہے۔

۹۶ خدا سے ڈرنے کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لیے یہ مدنظر ہونا چاہیئے کہ بندے پر خدا کے جو حقوق ہیں وہ کسی اور کے نہیں، خدا نے اپنے قائم کردہ حدود و قیود کو توڑنے کی جو سزا مقرر کی ہے وہ تمام تر بندوں کی دنیوی اور اخروی بہبود کے لیے کی ہے، خدا کی آنکھیں ہر جگہ نگران ہیں اور وہ دنیا اور آخرت میں سزا دے سکتا ہے جس سے کوئی دوسرا بچا نہیں سکتا۔ یہ ڈرنا عارضی اور وقتی طور پر مطلوب نہیں بلکہ یہ زندگی کی آخری سانس تک کا معاملہ ہے۔

۹۷ رسی دو چیزوں میں رابطہ و تعلق کا ذریعہ ہوتی ہے۔ بندوں کو خدا سے جوڑنے والی چیز اللہ کی کتاب ہے جس کو

فضل کو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اللہ نے تمہارے دلوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا اور تم اس کے فضل سے بھائی بھائی بن گئے اور تم آگ کے ایک گڑھے کے بالکل کنارے کھڑے تھے تو اللہ نے تمہیں اس سے بچا لیا۔ اسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنی ہدایات کو واضح کرتا ہے تاکہ تم راہ یاب ہو۔ اور چاہیے کہ تم میں ایک گروہ ایسا ہو جو نیکی کی دعوت دے، معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ ۱۰۴

اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو پراگندہ ہو گئے اور جنہوں نے اختلاف کیا[۸۹] بعد اس کے کہ ان کے پاس واضح ہدایات آ چکی تھیں اور وہی ہیں جن کے لیے بڑا عذاب ہے۔ اس دن جس دن کچھ چہرے روشن ہوں گے اور کچھ چہرے سیاہ ہوں گے تو جن کے چہرے سیاہ ہوں گے ان سے پوچھا جائے گا کہ کیا تم نے اپنے ایمان کے بعد کفر کیا[۹۰] تو اب چکھو عذاب اپنے کفر کی پاداش میں۔ رہے وہ جن کے چہرے روشن ہوں گے تو وہ اللہ کی رحمت کے سایہ میں ہوں گے، وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم تمہیں حق کے ساتھ سنا رہے ہیں اور اللہ عالم والوں پر کوئی ظلم نہیں کرنا چاہتا۔ اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب اللہ ہی کے لیے ہے اور سارے معاملات اللہ ہی کے حضور پیش کیے جاتے ہیں۔ ۱۰۹

تم بہترین امت ہو، لوگوں کی رہنمائی کے لیے مبعوث کیے گئے ہو، معروف کا حکم دیتے ہو، منکر سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو[۹۱]۔ اور اگر اہل کتاب بھی ایمان لاتے تو ان کے لیے یہ بہتر ہوتا۔

ہمارے اور تمہارے رب کے درمیان معاہدہ کی حیثیت حاصل ہے۔

۸۸ یعنی مسلمان جماعتی حیثیت میں ایک گروہ کو اس کام پر مقرر کریں جو سیاسی اختیار و اقتدار کا حامل ہو۔ اس آیت سے امت مسلمہ کے اندر خلافت کے قیام کا واجب ہونا ثابت ہوتا ہے۔

۸۹ مراد یہود و نصاریٰ ہیں جو خدا کی رسی چھوڑ بیٹھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے درمیان ایسے اختلافات پھوٹ پڑے جن کی اصلاح ناممکن ہو گئی۔

۹۰ کتاب اللہ سے محروم ہو جانے کے بعد ملت جس اختلاف و انتشار میں مبتلا ہوتی ہے وہ درحقیقت ایمان کے بعد کفر کی طرف پلٹ جانے کے ہم معنی ہوتا ہے۔

۹۱ اوپر یہ بات واضح کی گئی کہ اہل کتاب جس منصب امامت پر اب تک سرفراز رہے ہیں ہر پہلو سے وہ اس کے لیے نااہل ثابت ہو چکے ہیں۔ اب یہ امت مسلمہ کے منصب امامت پر فائز ہونے کا اعلان ہے۔ ساتھ ہی وہ صفات اور ذمہ داریاں بھی بتا دی ہیں جن کے ساتھ یہ منصب مشروط ہے۔

ان میں سے کچھ تو مومن ہیں اور اکثر نافرمان ہیں۔ وہ تمہیں تھوڑی سی زبان درازی کے سوا کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے اور اگر وہ تم سے جنگ کریں گے تو پیٹھ دکھائیں گے۔ پھر ان کی کوئی مدد بھی نہیں ہو گی۔ وہ جہاں کہیں بھی ہیں ان پر ذلت تھوپ دی گئی ہے۔ بس اگر کچھ سہارا ہے تو اللہ اور لوگوں کے کسی عہد کے تحت۔ وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے ہیں اور ان پر پست ہمتی تھوپ دی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اللہ کی آیتوں کا انکار اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے رہے ہیں، کیونکہ یہ نافرمان اور حد سے آگے بڑھنے والے رہے ہیں۔ ۱۱۲

سب اہل کتاب یکساں نہیں ہیں۔ ان میں ایک گروہ عہد پر قائم ہے۔ یہ رات کے وقتوں میں اللہ کی آیات کی تلاوت اور سجدہ کرتے ہیں۔ اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، معروف کا حکم دیتے ہیں، منکر سے روکتے ہیں اور بھلائی کے کاموں میں سبقت کرتے ہیں اور یہ لوگ نیکو کاروں میں سے ہیں۔ جو نیکی بھی یہ کریں گے تو اس سے محروم نہیں کیے جائیں گے اور اللہ خدا ترسوں سے[۹۳] باخبر ہے۔ ۱۱۵

بے شک جن لوگوں نے کفر کیا ان کے مال اور ان کی اولاد خدا کے مقابل میں کام آنے والے نہیں۔ یہ لوگ دوزخی ہوں گے اور وہ اسی دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ جو کچھ اس دنیا میں خرچ کرتے ہیں[۹۴] اس کی تمثیل ایسی ہے کہ کسی ایسی قوم کی کھیتی پر، جس نے اپنے اوپر ظلم کیا ہو، پالے والی ہوا چل جائے اور وہ اس کو تباہ کر کے رکھ دے۔ اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ یہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے رہے ہیں[۹۵]۔ ۱۱۷

---

۹۲ یہ یہود کی شامت اعمال اور بدبختی کا بیان ہے کہ یہ اپنی دنیا پرستی اور پست ہمتی کی وجہ سے منصب امامت کی ذمہ داریاں ادا نہ کر سکے، لہذا خدا کے غضب کے مستحق ٹھہرے۔ اگر یہ کہیں قائم ہیں تو اپنی سطوت و عزت کے اعتماد پر نہیں بلکہ اللہ والوں کی دی ہوئی امان یا لوگوں کے ساتھ کیے ہوئے معاہدات سے ان کو سہارا ملا ہوا ہے۔ یہ سہارے وقتی اور عارضی ہیں۔

۹۳ اہل کتاب کے جس قلیل گروہ کا یہاں ذکر ہے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا۔ فرمایا کہ یہ اسلام میں آ جانے کے بعد اپنی ان نیکیوں کا بھی پورا پورا اجر پائیں گے جو اسلام میں آنے سے پہلے انہوں نے کی ہیں۔

۹۴ اس سے مراد وہ خرچ ہے جو وہ اپنی رسمی دینداری کی نمائش کے لیے کرتے ہیں۔

۹۵ کفر و شرک کے ساتھ جو کام نیکی اور دینداری کی نوعیت کے کیے جاتے ہیں وہ سب اکارت جاتے ہیں۔ کفر و شرک ایسی ٹھنڈی آگ ہے جو ساری محنت کو راکھ کا ڈھیر بنا کے رکھ دیتی ہے۔ لہذا جو اہل کتاب نہ اپنے عہد پر قائم رہے نہ اسلام میں داخل ہوئے ان کا سارا کیا دھرا برباد ہو جائے گا۔ درخت اپنی جڑ کے سلامت رہنے سے سلامت رہتا ہے۔ اگر درخت کی جڑ اکھاڑ دی جائے تو اس کی شاخوں اور اس کے پتوں پر پانی دینے میں خواہ کوئی کتنی ہی محنت اٹھائے بے سود ہے۔ محنت کی بربادی پر قابل ملامت وہ خود ہوتا ہے نہ کہ قدرت اور قدرت کا قانون۔

اصولِ تدبرِ حدیث
امین احسن اصلاحی

حدیث کے غث و سمین میں امتیاز کے لیے اساسی کسوٹیاں

حدیث کے غث و سمین میں امتیاز کے لیے ہمارے نزدیک چھ بنیادی اصول ہیں جن کی حیثیت فنِ حدیث میں اساسی کلیات کی ہے۔ ان اصولوں کی رہنمائی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب روایات کے صحیح اور سقیم میں نہ صرف یہ کہ امتیاز آسان ہو جاتا ہے، بلکہ علمِ حدیث سے کما حقہ فیض یاب ہونے کے لیے حدیث کے طالب علم کو ان کا ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا ازبس ضروری ہے۔

یہ ایک نہایت حساس موضوع ہے اس لیے ہم اس امر کا اہتمام ضروری خیال کرتے ہیں کہ اپنے مباحث کی بنیاد احادیثِ رسول اور سلفِ صالحین کے ارشادات ہی پر رکھیں، اپنی جانب سے کوئی بات نہ کہیں۔ اس موضوع پر پیچھے بھی بعض ضروری باتیں عرض کی جا چکی ہیں، یہاں مقصود ان کو ایک ضابطہ کے تحت لانا ہے تاکہ پوری بحث سمٹ کر سامنے آجائے۔

ہمارے سلف میں اصولِ حدیث پر خطیب بغدادی علیہ الرحمۃ کو سند کی حیثیت حاصل ہے۔ انہوں نے نہایت تفصیل کے ساتھ تمام ضروری مباحث اپنی شاندار کتاب: الکفایة فی علم الروایة میں پیش کیے ہیں۔ ہماری یہ بحث بیشتر اس کے مندرجہ ذیل ابواب سے مستنبط ہے:

۱۔ باب فی وجوب اطراح المنکر والمستحیل من الاحادیث۔ یعنی منکر اور ناممکن حدیثوں کے رد کر دینے کے وجوب کے بیان میں۔

۲۔ باب ذکر ما یقبل فیه خبر الواحد ولا یقبل فیه۔ یعنی خبرِ واحد کن کن صورتوں میں قابلِ قبول ہوگی اور کن کن صورتوں میں قبول نہیں کی جائے گی۔

انہوں نے پورے استقصاء کے ساتھ اس موضوع پر بحث کی ہے اور ردّ و قبول کے لیے پہلی کسوٹی یہ قرار دی ہے۔

پہلی کسوٹی — اہلِ ایمان اور اصحابِ معرفت کا ذوق:

حدیث کے غث و سمین میں امتیاز کے لیے پہلی کسوٹی یہ ہے کہ کوئی روایت جس کو اہلِ ایمان اور اصحابِ معرفت کا ذوق قبول کرنے سے اباء کرتا ہے وہ قبول نہیں کی جائے گی۔ اس اصول کی طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود رہنمائی فرمائی ہے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے۔

عن ابی حمید ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: اذا سمعتم الحدیث عنی تعرفه قلوبکم و تلین له اشعارکم وابشارکم وترون انه منکم قریب فانا اولاکم به۔ واذا سمعتم الحدیث عنی تنکرہ قلوبکم وتنفر منه اشعارکم وابشارکم وترون انه منکم بعید فانا ابعدکم منه۔[1]

ابوحمید سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم مجھ سے منسوب کوئی ایسی روایت سنو جس سے تمہارے دل آشنائی محسوس کریں، تمہارے رونگٹے اور تن بدن اس سے اثر پذیر ہوں اور تم دیکھو کہ وہ تمہارے دلوں سے قریب ہے تو میں تمہاری نسبت اس کے زیادہ قریب ہوں اور جب تم مجھ سے منسوب کوئی ایسی بات سنو جس سے تمہارے دل اجنبیت محسوس کریں، تمہارے رونگٹے اور جسم اس سے ناگواری محسوس کریں اور تم دیکھو کہ وہ تمہارے مزاج سے دور ہے تو میں تمہاری نسبت اس سے زیادہ دور ہوں۔

'جلود' کے معنی تو کھال کے آتے ہیں، لیکن اس کا استعمال یہاں رونگٹوں کے لیے ہے۔ اس معنی میں اس کا استعمال قرآن مجید میں بھی ہوا ہے: 'تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ' (الزمر - ۳۹ : ۲۳) (اس سے ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرنے والے ہیں)۔ یہ عربیت کے اس قاعدے پر ہے کہ ظرف بولتے ہیں اور اس سے مظروف مراد لیتے ہیں۔ 'ابشار' 'بشر' کی جمع ہے۔ ہمارے نزدیک اس کا ترجمہ تن بدن کریں تو صحیح ترجمہ ہوگا اس لیے کہ 'بشر' اوپر کی کھال کو کہتے ہیں۔

اسی ذیل میں سلفِ صالحین کے چند اقوال ملاحظہ ہوں۔ ایک بزرگ کا ارشاد ہے

---

[1] کتاب الکفایة فی علم الروایة ص ۴۳۰

قال الربیع بن خیثم ان من الحدیث حدیثاً لہ ضوء کضوء النھار نعرفہ ۔ وان من الحدیث حدیثاً لہ ظلمۃ کظلمۃ اللیل ننکرہ[1]۔

ربیع بن خثیم نے کہا کہ حدیثوں میں ایسی حدیثیں ہوتی ہیں جن پر روزِ روشن کی تابانی ہوتی ہے، ہم ان کو پہچان لیتے ہیں اور حدیثوں میں بعض ایسی حدیثیں بھی ہوتی ہیں جن پر شب دیجور کی سیاہی ہوتی ہے، ہمارے قلوب ان کو قبول کرنے سے اباء کرتے ہیں۔

ولید بن مسلم فرماتے ہیں :

سمعت الاوزاعی یقول : کنا نسمع الحدیث ونعرضہ علی اصحابنا کما نعرض الدرھم الزائف ۔ فما عرفوا منہ اخذناہ وما انکروا منہ ترکناہ[2]۔

میں نے اوزاعی کو کہتے سنا ہے کہ ہم حدیث سن کر اپنے اصحاب کے سامنے اس طرح پیش کرتے تھے جس طرح کھوٹے اور کھرے درہم، تو جن کو وہ کھرا قرار دیتے ہیں ان کو تو ہم قبول کر لیتے اور جن کو وہ کھوٹا محسوس کرتے ان کو ہم چھوڑ دیتے۔

اس سلسلہ میں جریر اپنا معمول یہ بیان فرماتے ہیں :

کنت اذا سمعت الحدیث جئت بہ الی المغیرۃ فعرضتہ علیہ ۔ فما قال لی : القہ القیتہ[3]

جب میں کوئی حدیث سنتا تو مغیرہ کے ہاں پہنچ جاتا اور ان سے وہ حدیث بیان کرتا۔ تو جس کے متعلق وہ کہتے کہ اس کو پھینک دو تو میں پھینک دیتا۔

مذکورہ بالا اقوال سے چند باتیں نہایت واضح طور پر ثابت ہوتی ہیں :

ایک یہ کہ کسی حدیث کے قولِ رسول ہونے کا انحصار اس کی سند سے زیادہ اس کے معنی و مفہوم پر ہے جس کا فیصلہ وہ لوگ کر سکتے ہیں جو رسول کے کلام کا ذوق اور اس کی شناخت کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ خود کلام کو سن کر اور اپنے دل و دماغ پر اس کے اثر سے پہچان لیتے ہیں کہ یہ رسول کا کلام ہو سکتا ہے یا نہیں؟ یہ ذوق ظاہر ہے کہ ہر شخص کے اندر نہیں پیدا ہو سکتا، بلکہ انہی لوگوں کے اندر پیدا ہو سکتا ہے جن کی فطرت سلیم اور جن کا مذاق نہایت اعلیٰ ہو، جن کا ذہن سفاہت سے دور ہو، جنھوں

---

[1] کتاب الکفایۃ فی علم الروایۃ ص ۴۳۱

[2] کتاب الکفایۃ فی علم الروایۃ ص ۴۳۱

[3] کتاب الکفایۃ فی علم الروایۃ ص ۴۳۲

نے رسول کی اچھی طرح صحبت اٹھائی ہو یا آپ کے کلام کی مہارت بہم پہنچائی ہو۔

اس سے یہ بات بھی لازماً نکلتی ہے کہ اگر ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا صحبت یافتہ تو نہ ہو لیکن اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی پوری مہارت ہو، اس کے پاس فہمِ دین کا اعلیٰ ذوق ہو اور اس نے اس کی تربیت کے لیے پوری محنت کی ہو تو کیا اس معاملے میں اس کا ذوق معتبر نہیں ہوگا؟ ہمارے نزدیک اس کو معتبر ہونا چاہیے۔ آپ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ درجے کا فرق ہوگا۔ اس فرق کا ہونا فطری امر ہے۔ قرآن کی اس بات کو یاد رکھیے کہ دورِ آخر میں بھی ایسے لوگ پیدا ہوں گے جن کا شمار دورِ اول کے لوگوں کے زمرہ میں ہوگا تو کیا اس کا امکان نہیں ہے کہ بعد میں بھی ایسے ذوق سلیم کے حاملین ہوں جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی ایسی مہارت ہو کہ وہ، اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ معرفت اور بصیرت کی روشنی میں، امتیاز کر کے یہ کہہ سکیں کہ یہ بات تو قولِ رسول ہو سکتی ہے، لیکن فلاں بات نہیں ہو سکتی۔

دوسری یہ کہ ہر حدیثِ رسول دل میں ایک اہتزاز پیدا کرتی ہے، بشرطیکہ دل زندہ ہو۔ یہ اہتزاز بشارت کی نوعیت کا بھی ہو سکتا ہے اگر حدیث بشارت کی نوعیت کی ہو، خشیت کی نوعیت کا بھی ہو سکتا ہے اگر حدیث انذار کی نوعیت کی ہو۔ علیٰ ہذا القیاس وہ طمانیت، سکینت اور شرحِ صدر پیدا کرنے والی بھی ہو سکتی ہے۔ اگر وہ حکمت کے باب کی ہے، بہرحال اس کو سن کر کوئی صاحبِ قلبِ سلیم، یہ ممکن نہیں کہ بے حس پڑا رہ جائے۔ بلکہ اس کے باطن میں ایک ہلچل پیدا ہوگی اگر وہ مردہ نہیں ہو چکا ہے۔

تیسری یہ کہ جس طرح قرآن کی زبان کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے اور وہ کسی دوسرے کی زبان سے لگا نہیں کھاتی اسی طرح سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان کی امتیازی شان ہے۔ قرآن کی زبان اور حضور کی زبان میں بس ایک درجے کا فرق ہے اور یہ ذرا سا جو کچھ فرق ہو جاتا ہے تو فطری طور پر ایسا ہونا بھی چاہیے اس لیے کہ نبی کا کلام بہرحال اللہ کے کلام کے برابر نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں ایک ایسی گیرائی و گہرائی اور ایسی عظمت و نفاست ہوتی ہے جو کسی دوسرے کلام میں نہیں ہوتی۔ اس کو کوئی بیان کرنا چاہے تو بیان تو نہیں کر سکتا، لیکن ایک صاحبِ ذوق محسوس ضرور کر لیتا ہے اور اس کا دل پکار اٹھتا ہے کہ یہ رسول ہی کا کلام ہو سکتا ہے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں میں معنوی جمال کے ساتھ ساتھ ایک ظاہری جمال بھی ہوتا ہے۔ جو ان لوگوں کو نظر آتا ہے جو اس جمال سے آشنا ہو چکے ہوتے ہیں۔ اس طرح کے ادا شناس ہر اس چیز میں جو حدیثِ رسول کے نام سے پیش کی جاتی ہے اس جمال کو تلاش کر لیتے ہیں۔ اگر یہ چیز ان کو نہیں ملتی تو وہ اندازہ کر لیتے ہیں کہ یہ گہر نہیں بلکہ پشیز ہے جس کو گہر کے نام سے پیش کرنے اور لوگوں کو دھوکا دینے

کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس کے برعکس اگر کسی دوسرے کا کلام رسول کے کلام کی حیثیت سے اس کے آگے پیش کیا جائے تو اس کو سنتے ہی وہ تاڑ جاتا ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام نہیں ہے اگرچہ اس میں کچھ حسن بھی ہو۔ اور اگر وہ کوئی منکر بات ہو تب تو وہ بدرجۂ اولیٰ اس کو رد کر دیتا ہے اس لیے کہ وہ رسول کے کلام میں کسی منکر بات کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔

خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ' انا افصح العرب والعجم ' (میں عرب وعجم، دونوں میں فصیح ترین ہوں)۔ آپ دعاؤں کا کوئی مجموعہ لے کر پڑھیے۔ اگر آپ کے اندر عربیت کا کچھ ذوق ہے تو آپ فوراً امتیاز کرلیں گے کہ یہ دعا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ماثور ہے اور یہ بعد والوں کی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس حدیثوں میں جو اقوالِ حکمت ہیں ان کے اندر تو آپ کو یہ ماننا پڑے گا کہ یہ شان، یہ عظمت، یہ شکوہ، یہ سادگی و پرکاری یہ حسن وجمال اور دل ربائی جو پائی جاتی ہے تو یہ کسی عام آدمی کے کلام میں ہرگز ممکن نہیں۔ یہ تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے کلام کی شان ہوسکتی ہے۔

بہرحال احادیث کے پرکھنے اور ان کے صحیح وسقیم میں امتیاز کے لیے ذوقِ سلیم کو بڑا دخل ہے۔ نہ تو ایک بلید آدمی اس ذوق کا حامل ہوسکتا اور نہ یہ مستعار لیے جانے کی چیز ہے۔ یہ ذوق صالح فطرت، راسخ ایمان، گہری معرفت وبصیرت اور قولِ رسول کی مسلسل ممارست سے حاصل ہوتا ہے۔ اور جن کے اندر یہ ذوقِ سلیم ہوتا ہے وہ جس طرح قولِ رسول کے حسن کو پرکھتے ہیں اسی طرح اس کے ضد کے قبح کو دیکھ لیتے ہیں۔ اس لیے کہ جس کی تحویل میں جواہر ریزے ہوں وہ ان میں خزف ریزوں کو ملانا پسند نہیں کرے گا۔

یہاں اس امر کا بیان بھی ضروری ہے کہ ایسے ذوق آشناؤں کو اگر کہیں اشتباہ بھی پیش آئے گا تو بہت کم۔ اس نوع کا اشتباہ بہرحال مانع فہم نہیں ہوتا بلکہ وہ سمجھنے کے لیے راہ کھولتا ہے۔ اس سے وہ اصول باطل نہیں ہوتا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے۔

اہلِ ایمان اور اصحابِ معرفت کے ہاں اقوالِ رسول کی پہچان کی نوعیت کی وضاحت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پُرحکمت حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ:

فقالوا: کیف تعرف من لم یات بعد من امتك؟ یا رسول اللہ! فقال: ارایت لو ان رجلا له خیل غر محجلة بین ظهری خیل دهم بهم الا یعرف خیله؟ قالوا: بلیٰ یا رسول اللہ. قال: فانهم یاتون غرا محجلین من الوضوء[1].

صحابہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ اپنی امت کے ان لوگوں کو کیونکر پہچانیں گے جن کو آپ نے نہیں دیکھا؟ آپ نے فرمایا: بھلا دیکھو اگر ایک شخص کے سفید پیشانی اور سفید ہاتھ پاؤں کے گھوڑے سیاہ مشکی گھوڑوں میں مل جائیں تو وہ اپنے گھوڑے نہیں پہچانے گا؟ صحابہؓ نے عرض کیا: بے شک، یارسول اللہ! حضورؐ نے ارشاد فرمایا: تو میری امت کے لوگ وضو کے آثار سے سفید منہ اور سفید ہاتھ پاؤں رکھتے ہوں گے۔

ہمارے نزدیک یہی تمثیل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام اور دوسروں کے کلام کی ہے۔ وہ بھی دور سے پہچانا جاتا ہے، بشرطیکہ ذوقِ سلیم اور نگاہ جوہر شناس ہو۔

دوسری کسوٹی —— عملِ معروف :

حدیث کے غث وسمین میں امتیاز کے لیے دوسری کسوٹی عملِ معروف ہے۔ اس کی ہدایت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ملتی ہے:

عن محمد بن جبیر بن مطعم عن ابیه قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم: ماحدثتم عنی مما تعرفونه فخذوه. وما حدثتم عنی مما تنکرونه فلا تاخذوا به. قال: فانی لا اقول المنکر ولست من اهله[2].

محمد بن جبیر بن مطعم اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر مجھ سے منسوب کرکے کوئی روایت اس معروف کے مطابق کی جائے جس سے تم آشنا ہو تو اس کو قبول کرلو اور اگر مجھ سے منسوب کرکے کوئی ایسی روایت کی جائے جس کو تم منکر محسوس کرو تو اس کو نہ قبول کرو۔ حضورؐ نے فرمایا کہ نہ میں منکر کہتا ہوں اور نہ میں منکر باتیں کرنے والوں میں سے ہوں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر روایت تمہاری معروفات کے مطابق ہو تو اس کو قبول کرو اور اگر ان سے متصادم ہو تو اس کو رد کردو۔ دوسرے الفاظ میں اس کو یوں سمجھیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کو غیر مطلوب ملاوٹ سے پاک رکھنے کے لیے یہ ہدایت فرمائی کہ اگر کوئی نئی چیز تمہارے سامنے دین کے نام سے لائی جائے تو دین کا جو پاکیزہ ذخیرہ تمہارے پاس پہلے سے موجود ہے اس سے اس کا موازنہ کرو۔ اگر یہ نئی چیز

---

[1] صحیح مسلم : کتاب الطہارۃ ، باب ١٢

[2] کتاب الکفایۃ فی علم الروایۃ ص ٤٣٠

صورۃً اور معناً اس سے میل رکھنے والی ہے تو اس کو قبول کرو، اگر یہ اس سے میل نہیں کھاتی تو اس کو رد کر دو۔ ساتھ ہی آپ نے خود اپنا مزاج بھی بتا دیا کہ نہ میں منکر باتیں کہتا اور نہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو منکر باتیں کہتے ہیں۔ یعنی میری نسبت یہ فرض کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ میں اچھی باتیں کہتے کہتے ——— العیاذ باللہ ——— خرافات سے بھی آلودہ ہو جاتا ہوں۔ میری زبان سے جو کچھ بھی نکلا ہے سب پاکیزہ نکلا ہے۔ اس میں کامل ہم آہنگی ہے۔ شاعروں کی طرح میں ہر وادی میں نہیں بھٹکتا۔ اس ہم آہنگی کی اگر حفاظت کرو گے تو شیاطینِ انس و جن تمہارے جواہر ریزوں میں اپنے خزف ریزے ملانے میں کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔ اور اگر اس ہم آہنگی کو بھول گئے یا اس کا شعور تمہارے اندر باقی نہ رہا تو پھر سب کچھ کھو بیٹھو گے۔ اس کی وضاحت اس وجہ سے بھی ضروری تھی کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت یہ گمان کیا جا سکے کہ ——— العیاذ باللہ ——— آپ گاہ گاہ منکر باتیں بھی کر لیتے تھے تو پھر دین میں منکرات کے لیے بڑی گنجائش نکل آتی ہے۔ ایک شخص یہ گمان کر سکتا ہے کہ ایک خاص حالت میں ——— نعوذ باللہ ——— آپ نے یہ باتیں بھی کہہ دی ہوں گی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جو فرمایا ہے کہ اگر مجھ سے منسوب کر کے کوئی روایت اس معروف کے مطابق کی جائے جس سے تم آشنا ہو تو اس کو قبول کر لو اور اگر مجھ سے منسوب کر کے کوئی ایسی روایت کی جائے جس کو تم منکر محسوس کرو تو اس کو نہ قبول کرو تو اس سے حضورؐ کی مراد کتاب اللہ اور سنتِ رسول ہے اور یہاں منکر کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ تمام چیزیں جو ان اصول، کلیات، ارشادات اور احکامات کے منافی ہوں جو حضورؐ نے دیے ہیں۔ اس روشنی میں اگر ان اسرائیلی قصوں اور تفسیری روایات کا جائزہ لیا جائے جنہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت دے کر مقدس بنا دیا گیا ہے تو معلوم ہوگا کہ وہ اس کسوٹی کی زد میں آتے ہیں۔ مثلاً انبیاء و رسل علیہم السلام کے عظیم الشان کردار اور شخصیت کی ایک شان تو وہ ہے جس کی نشان دہی قرآن مجید اور صحیح احادیث سے ہوتی ہے اور ایک وہ نہایت افسوس ناک اور قابلِ مذمت تصویر ہے جو بعض روایات سے بنتی ہے اور جس کی زد حضرات ابراہیم، لوط، داؤد اور سلیمان علیہم السلام جیسے جلیل القدر پیغمبروں پر پڑتی ہے۔ ایسی تمام روایات منکر کے حکم میں آتی ہیں اور پھینک دیے جانے کے قابل ہیں۔ اور تو اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کی زد سے نہیں بچے ہیں۔

یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ یہی منکر روایات دینِ اسلام اور اکابرینِ دین پر مستشرقین کے حملوں کا ذریعہ بنی ہیں۔ آپ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ رنگ آمیزی کا کام انہوں نے کیا ہے لیکن مواد کے فراہم کرنے کی ذمہ داری سے آپ نہیں بچ سکتے۔

عملِ معروف کی کسوٹی اگر صحیح طریقے سے مستحضر ہو تو غلط حدیث بھی آپ کو دھوکا نہیں دے سکتی۔ آپ صاف سمجھ جائیں گے کہ یہ قرآن کے کھلے کے بالکل خلاف ہے، یہ سنتِ الٰہی کے خلاف ہے، یہ حضورؐ کے عملی تواتر کے خلاف ہے، بنا بریں اسے منکرات میں ڈال دینا چاہیے۔

تیسری کسوٹی ——— قرآن مجید:

حدیث کے غث و سمین میں امتیاز کے لیے تیسری کسوٹی قرآن مجید ہے۔ اس باب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال: سیاتیکم عنی احادیث مختلفۃ۔ فما جاءکم موافقا لکتاب اللہ وسنتی فھو منی وما جاءکم مخالفا لکتاب اللہ تعالیٰ وسنتی فلیس منی۔[1]	حضرت ابوہریرہؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا عنقریب تمہارے سامنے مجھ سے منسوب ایسی روایتیں آئیں گی جو باہمدگر متناقض ہوں گی تو جو کتاب اللہ اور میری سنت کے موافق ہوں وہ تو مجھ سے ہیں اور جو کتاب اللہ اور میری سنت کے مخالف ہوں وہ مجھ سے نہیں ہیں۔

اس حدیث سے ہمیں دو اصولوں کی تعلیم دی گئی ہے۔ لیکن ہم یہاں صرف کتاب اللہ کے کسوٹی ہونے پر بحث کریں گے، سنتِ رسول پر بحث چوتھی کسوٹی کے تحت آئے گی۔

اس میں ہمیں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ کوئی حدیث جو کسی پہلو سے قرآن کے خلاف ہوگی وہ قبول نہیں کی جائے گی۔ قرآن اور حدیث و سنت کے باہمی تعلق کے تحت اس موضوع پر ہم سیر حاصل گفتگو کر چکے ہیں اس مضمون میں واضح کیا جا چکا ہے کہ قرآن ہر چیز پر نگران ہے۔ حق و باطل میں امتیاز کے لیے یہی اصلی کسوٹی ہے اس وجہ سے کوئی چیز اس کے خلاف قبول نہیں کی جا سکتی۔ بعض غالی اہلِ حدیث نے حدیث کو قرآن پر حاکم بنانے کی جو کوشش کی ہے ان کے اس غلط مسلک کی تردید حدیث کے صاحب البیت: امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے اس ارشاد کی روشنی میں ہو چکی ہے۔ فضل بن زیاد سے مروی ہے:

قال: سمعت احمد بن حنبل	وہ کہتے ہیں کہ میں نے احمد بن حنبل سے سنا اور

---

[1] کتاب الکفایۃ فی علم الروایۃ ص ۴۳۰

وسئل عن الحديث الذی روی ان السنة قاضية علی الكتاب قال: ما اجسر علیٰ هذا ان اقوله ولكن السنة تفسر الكتاب وتعرف الكتاب وتبينه[1].

ان سے سوال کیا گیا تھا اس قول (حدیث) کے بارے میں جس کی روایت ہوئی کہ 'السنة قاضية على الكتاب' (سنت کتاب اللہ پر حاکم ہے) تو انہوں نے فرمایا کہ مجھ میں یہ کہنے کی جسارت نہیں کہ سکوں۔ سنت تو قرآن کی تفسیر کرتی، اس کی تعریف کرتی اور اس کی مجمل باتوں کی وضاحت کرتی ہے۔

حدیث کے صحیح وسقیم میں امتیاز کے لیے کتاب اللہ کی کسوٹی اور آگے زیر بحث آنے والی تین کسوٹیوں کے بارے میں خطیب بغدادی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ:

ولا يقبل خبر الواحد فی منافاة حكم العقل وحكم القرآن الثابت المحكم والسنة المعلومة والفعل الجاری مجری السنة وكل دليل مقطوع به[2].

اور ان صورتوں میں خبر واحد قبول نہیں کی جائے گی: جب وہ عقل کے فیصلے کے منافی ہو؛ جب وہ قرآن کے ثابت اور محکم حکم کے خلاف ہو؛ جب وہ سنت معلومہ یا اس عمل کے خلاف ہو جو سنت ہی کی طرح معمول بہ ہے؛ اور جب وہ دلیل قطعی کے منافی ہو۔

'منافاۃ' کے معنی ہیں کلی تضاد۔ یہاں ہم صرف مصنف علیہ الرحمۃ کی قرآن کے منافی روایات کے حصے تک اپنی بحث کو محدود رکھیں گے۔ ان کے خیال میں منافی قرآن روایات قبول نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ قرآن ہر چیز کے جانچنے کے لیے محک اور کسوٹی ہے۔ اس کی صحت میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ وہ امت کے قولی تواتر سے ثابت ہے اس وجہ سے کوئی خبر واحد اس کے خلاف قبول نہیں کی جائے گی۔ خبر واحد نہ قرآن کو منسوخ کر سکتی، نہ اس میں کوئی ترمیم کر سکتی اور نہ کسی پہلو سے اس پر اثر انداز ہو سکتی۔

چوتھی کسوٹی —— سنتِ معلومہ:

حدیث کے صحیح وسقیم کی پرکھ کے لیے چوتھی کسوٹی سنتِ معلومہ ہے۔ محولہ بالا حدیث کی روشنی میں

[1] کتاب الكفاية فی علم الرواية ص ۱۵
[2] کتاب الكفاية فی علم الرواية ص ۴۳۲

سنت کا جو ذخیرہ امت کی تحویل میں ہے وہ بجائے خود بھی کسوٹی ہے۔ کوئی چیز جو اس سنتِ معلومہ سے بے گانہ یا متصادم ہوگی وہ قبول نہیں کی جائے گی کہ سنن عمل تواتر سے ثابت ہیں، ان پر اخبارِ آحاد اثر انداز نہیں ہو سکتیں۔ سنن روایات کے بالمقابل قدیم تر ہیں۔

یہاں وہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے جو "حدیث اور سنت کے درمیان فرق" سے متعلق مضمون میں بیان کی جا چکی ہے کہ ایک ہی معاملہ میں سنت مختلف بھی ہو سکتی ہے، لیکن کسی چیز میں شکل و صورت کا کچھ اختلاف اور چیز ہے اور کسی چیز کا اس کے مخالف ہونا اور چیز ہے۔ یہ نکتہ اچھی طرح ذہن نشین رہنا چاہیے۔

سنت عملی تواتر سے ثابت ہے اس وجہ سے اس کے ردّ و قبول کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ اخبارِ آحاد کے متعلق علماء نے تصریح کی ہے کہ بعض صورتوں میں وہ لازماً رد کر دی جاتی ہیں۔ اس مسئلہ پر مفصل بحث ہم اخبارِ آحاد کی حجیت والے مضمون میں کر چکے ہیں جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، خطیب بغدادیؒ کے نزدیک بھی وہ تمام اخبارِ آحاد جو منافی سنتِ معلومہ اور عمل قائم مقام سنت کے حکم میں داخل ہیں رد کر دی جائیں گی۔

اسی طرح 'الفعل الجاری مجری السنة' (عمل قائم مقام سنت) کے منافی خبر واحد بھی قبول نہیں کی جائے گی۔

'الفعل الجاری مجری السنة' سے صاحب الکفایہ کی مراد غالباً وہی چیز ہے جس کو مالکیہ 'العمل عندنا هكذا' سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی کسی باب میں کوئی عمل معروف کی حیثیت سے چلا آ رہا ہے۔ اس طرح کے عمل کو مالکیہ سنت ہی کے درجہ میں رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ جو عمل پوری جماعت میں اس طرح چلا آ رہا ہے، اس کے متعلق قرینہ یہی ہے کہ اس کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی منظوری حاصل ہے۔ اس وجہ سے مالکیہ اہل مدینہ کی سنت کے خلاف جس طرح دوسری سنت کو قبول نہیں کرتے اسی طرح اپنے اندر کے لوگوں کے اس عمل کو بھی جو تواتر کے ساتھ چلا آ رہا ہے خبرِ واحد کے مقابل میں زیادہ قابل اطمینان خیال کرتے ہیں۔ یہی حال حنفیہ کا بھی ہے۔ وہ بھی ان مسائل میں جن کا تعلق عام لوگوں کی زندگی سے ہو اخبارِ آحاد کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے، بلکہ اس عمل کو ترجیح دیتے ہیں جو لوگوں نے اپنے انتخاب و اجتہاد سے اختیار کر رکھا ہوتا ہے یا اس معاملہ میں اجتہاد کو ترجیح دیتے ہیں۔ عمومِ بلویٰ کی صورت میں ان کے نزدیک اجتہاد خبرِ واحد سے زیادہ قرینِ احتیاط ہے۔ اس لیے کہ ایک اجتہادی غلطی کی اصلاح تو ممکن ہے لیکن کسی روایت کو قولِ رسول غلط طور پر مان لینے کے بعد اس کا انکار چنداں آسان

نہیں رہ جاتا۔

پانچویں کسوٹی ـــــ عقلِ کلی :

عقل کی حدیث کے غث وسمین میں امتیاز کے لیے پانچویں کسوٹی کا کام دیتی ہے۔ اس باب میں صاحب الکفایہ کا حوالہ اوپر گزر چکا ہے۔

عقل کے منافی روایات قبول نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ دین کی بنیاد، جیساکہ دوسری جگہ بیان ہوچکا ہے، تمام تر عقل وفطرت ہی پر ہے۔ عقل وفطرت ہی کے مقتضیات ومطالبات ہیں جو قرآن اور سنت میں اجاگر کیے گئے ہیں اور اللہ ورسول نے عقل اور فطرت ہی کے حوالے سے لوگوں پر حجت قائم کی ہے اور ان لوگوں کو عقل کا دشمن گردانا ہے جنہوں نے ہوائے نفس کی پیروی میں دینِ فطرت کی مخالفت کی۔ ایسی صورت میں یہ کس طرح ممکن ہے کہ کوئی ایسی روایت قبول کی جائے جو دین کی اصل بنیاد ہی کی نفی کرنے والی ہو۔ چنانچہ منافیٔ عقل روایات قبول نہیں کی جائیں گی۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں زیرِ بحث افراد وافراد کی عقل نہیں، بلکہ عقلِ کلی ہے جو انسانوں پر اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا شرف ہے۔ بہت سے لوگ بعض نہایت احمقانہ باتوں کو مانتے ہیں اور نہایت اعلیٰ باتوں کی نفی کرتے ہیں، اس طرح کے لوگ یہاں زیرِ بحث نہیں ہیں۔ یہاں صرف اس عقل سے بحث ہے جو بے لاگ ہوکر فیصلے کرتی ہے اور جس کے فیصلوں کو اس دنیا کے تمام عاقلوں کی تائید حاصل ہے۔ ایسی عقل کے فیصلے کسی ایسی چیز سے نہیں روکے جاسکتے جس کے متعلق یہ اعتماد نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس کی نسبت صحیح بھی ہے یا نہیں؟

یہاں یہ بھی غور کرلیجیے کہ صاحب الکفایہ نے منافات کا لفظ استعمال کیا ہے۔ منافات کے معنی، جیساکہ ہم بیان کرچکے ہیں کلی تضاد کے ہیں۔ فرض کرلیجیے کہ دو چیزوں میں تطبیق ہوسکتی ہے تو تطبیق دے لیں۔ اس میں اعتراض کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ لیکن اگر صورتِ حال یہ ہے کہ نہ تو تطبیق ہوسکتی اور نہ ترجیح ہی ہوسکتی تو اس شکل میں کیا کریں گے۔ اگر اختلاف کی نوعیت راجح اور مرجوح کی ہوتی ہے تو راجح اور مرجوح کا فیصلہ کرکے راجح کو لے لیا جاتا ہے اور مرجوح کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ لیکن جب ہر پہلو سے منافات ہوگی تو لازماً ایک چیز رد کردی جائے گی۔

اسی طرح سے ایک چیز کا ایک شخص کی سمجھ میں نہ آنا الگ چیز ہے اور منافات کا ہونا الگ چیز ہے۔ مثلاً ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جنت میں پانی بھی ہوگا، آگ بھی ہوگی

اور درخت بھی ہوں گے۔ تو یہ تو یہ ہوسکتا ہے کہ بہت سے وجوہ کی بنا پر اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آرہی ہو، لیکن یہ منافات نہیں ہوگی بلکہ یہ اس کی عقل کی نارسائی ہے۔ اسی طرح سے مثلاً قرآن مجید کہتا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ گنہگاروں اور نیکوکاروں، دونوں کو یکساں کردے، تم لوگ کیسے فیصلے کرتے ہو۔ یعنی یہ ماننا کہ خدا کے ہاں اندھیر نگری ہے کوئی نیکوکار ہو یا بدکار اللہ تعالیٰ کو اس سے کوئی بحث نہیں اس کے ہاں دونوں یکساں ہیں۔ ظاہر ہے اس بات میں اور عقل میں صریح منافات ہے۔ اس بات میں تو کوئی منافات نہیں ہے کہ دوزخ میں پانی، آگ اور درخت تینوں ہوں گے۔ اس لیے کہ آگ کے درخت تو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں بھی پیدا کر رکھے ہیں۔ سب سے زیادہ زوردار آگ تو پانی میں ہوتی ہے جس کو ہم دنیا میں دیکھتے ہیں۔ یہ بہرحال بات کو نہ سمجھ پانے کا چکر ہے، اس میں کوئی منافات نہیں ہے۔ لیکن دوسری مثال کو مان لینے سے ظلم اور عدل کا سوال اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کائنات کا خالق ومالک سراپا عدل ہے اس کی شہادت آفاق اور انفس میں قدم قدم پر ملتی ہے۔ اس کو غیر عادل ماننا عقل سے صریح منافات ہے۔ وہ خود تعلیم دیتا ہے کہ یہ عدل ہے، اس کو اختیار کرو۔ یہی تمام انبیاء کی تعلیم ہے۔ یہی تمام آسمانی صحیفوں کی تعلیم ہے۔ اسی عدل پر آسمان وزمین قائم ہیں۔ اگر یہ عدل نہ ہوتا تو سب تباہ وبرباد ہوجاتا۔ اب کس طریقے سے یہ ممکن ہے کہ اس کے لیے ظلم اور عدل، دونوں یکساں ہوں۔ عقل کے بعض دشمن یہاں تک کہتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ اگر تمام نیکوں کو جہنم میں جھونک دے تو یہی ٹھیک ہے اور اگر تمام بدوں کو جنت میں داخل کردے تو یہ بھی ٹھیک ہے، وہ ایسا کرسکتا ہے۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ یہ بالکل عدل کے خلاف ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا اس لیے کہ یہ کائنات تو عدل ہی پر قائم ہے۔ اس کے تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کے یہ جہان ایک لمحہ کے لیے بھی قائم نہیں رہ سکتا اور عدل میں ذرا برابر بھی رخنہ پیدا ہوجائے تو آسمان وزمین تمام درہم برہم ہوسکتے ہیں۔ ہم بہرحال قطعی طور پر یہ مانتے ہیں کہ دین کی بنیاد عقل وفطرت پر ہے اس کی اپیل بھی اسی پر ہے اس وجہ سے دین کی کوئی بات عقل کے منافی نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا ایسی تمام روایات رد کردی جائیں گی جو عقلِ کلی کے منافی ہوں گی۔

چھٹی کسوٹی ـــــ دلیلِ قطعی :

حدیث کے غث وسمین میں امتیاز کے لیے چھٹی اور آخری کسوٹی دلیلِ قطعی ہے۔ جیساکہ ابھی گزر چکا ہے خطیب بغدادیؒ بھی اس اصول کو مانتے اور پیش کرتے ہیں کہ دلیلِ قطعی کے منافی خبرِ واحد قبول

نہیں کی جائے گی۔

دلیل خواہ عقلی ہو یا نقلی، بہرحال ایک ایسی خبر کے مقابل میں اپنے اندر زیادہ اطمینان کا پہلو رکھتی ہے جس کی رسول کی طرف نسبت مشکوک ہے۔ اتباعِ رسول کے پہلو سے بھی مشکوک خبر کے مقابل میں دلیل کی راہ زیادہ مامون ہے۔ یہ گمان صحیح نہیں ہے کہ رسول سے نسبت رکھنے والی بات اگرچہ اس کی نسبت مشکوک بھی ہو عقلی فیصلوں سے زیادہ قابلِ اطمینان ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اجتہاد کی غلطی میں مبتلا ہونا جھوٹ میں پڑنے سے بہرحال اہون ہے۔ اجتہاد کی غلطی کی اصلاح ہو سکتی ہے، لیکن اگر اللہ کے رسول کی طرف کوئی غلط طور پر منسوب بات مذہب بن گئی تو اس کے فتنے بہت دور تک پہنچیں گے اور ان کی اصلاح کا کوئی امکان باقی نہیں رہے گا۔

خلاصہ بحث:

حدیث کے غث و سمین میں امتیاز کے لیے چھ رہنما اصول ہیں جن کی حیثیت ان بنیادی کسوٹیوں کی ہے جن پر پرکھ کر کے حدیث کے صحیح و سقیم کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ اساسی کلیات یہ ہیں:

۱۔ کوئی روایت جس کو اہلِ ایمان اور اصحابِ معرفت کا ذوق قبول کرنے سے ابا کرتا ہے وہ قبول نہیں کی جائے گی۔
۲۔ جو شاذ روایت عملِ معروف کے خلاف ہوگی وہ قبول نہیں کی جائے گی۔
۳۔ کوئی روایت جو کسی پہلو سے قرآن مجید کے خلاف ہوگی قبول نہیں کی جائے گی۔
۴۔ جو روایت سنتِ معلومہ کے خلاف ہوگی وہ قبول نہیں کی جائے گی۔
۵۔ جو روایت عقلِ کلی کے فیصلوں کے خلاف ہوگی وہ قبول نہیں کی جائے گی۔
۶۔ جو روایت دلیلِ قطعی کے خلاف ہوگی وہ قبول نہیں کی جائے گی۔

(ترتیب: ماجد خاور)

خالد مسعود

مماثل کردار کی یکساں سزا

عن ابی ھریرۃ قال، قال رسولُ اللہِ صلی اللہ علیہ وسلم ثلاثٌ لا یکلمھمُ اللہُ یومَ القیٰمۃِ ولا ینظرُ الیھم ولا یزکیھم ولھم عذابٌ الیمٌ۔ رجلٌ علی فضلِ ماءٍ بالفلاۃِ یمنعہ من ابنِ السبیلِ، ورجلٌ بایعَ رجلاً بسلعتِہ بعدَ العصرِ فحلفَ لہ باللہِ لاخذھا بکذا وکذا فصدقہ وھو علی غیرِ ذلک، ورجلٌ بایعَ اماماً لا یبایعہ الا للدنیا فان اعطاہ منھا وفیٰ وان لم یعطہ منھا لم یفِ۔

(صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان الثلاثۃ الذین لا یکلمھم اللہ)

"حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین شخص ایسے ہیں جن سے قیامت کے روز اللہ تعالیٰ نہ کلام کرے گا، نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔ ایک وہ شخص بیابان میں جس کے پاس اپنی ضرورت سے زائد پانی ہو اور وہ اسے مسافر سے روکے، دوسرا وہ شخص جو عصر کے بعد کسی دوسرے آدمی کے ساتھ سامان کا سودا کرے تو اس کے سامنے اللہ کی قسم کھا کر کہے کہ اس نے یہ سامان اتنے میں لیا تھا اور وہ آدمی اس کو سچا جان لے حالانکہ حقیقت میں ایسا نہ ہو، تیسرا وہ شخص جو امام کی بیعت کرے لیکن یہ بیعت صرف دنیاوی اغراض کے لیے ہو۔ اگر امام ان کو پورا کر دے تو یہ شخص بیعت کو نبھائے اور اگر وہ اسے کچھ نہ دے سکے تو بیعت کا حق ادا نہ کرے۔"

روایت کے دوسرے طُرق:

صحیح مسلم میں یہ روایت اعمش، ابوصالح، ابوہریرہؓ کے واسطہ سے آئی ہے۔ اسی واسطے امام بخاری

نے اسے کتاب الاحکام اور کتاب الشہادات میں لیا ہے۔ ان کی روایت میں بالفلاۃ (بیابان میں) کی جگہ بالطریق (راستے میں) کا لفظ آیا ہے۔ اعطاہ منہا (اس میں سے اسے دے) کی جگہ اعطاہ ما یرید (جو کچھ وہ چاہتا ہو اسے دے) کے الفاظ ہیں اور اشخاص کے بیان کی ترتیب بدلی ہوئی ہے۔ بنیادی طور پر روایت ایک ہی ہے۔ البتہ امام بخاری نے یہی روایت سفیان، عمرو، ابوصالح، ابوہریرۃؓ کے واسطے یوں بیان کی ہے:

عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ثلاثۃ لا یکلمھم اللہ یوم القیمۃ ولا ینظر الیھم، رجل حلف علی سلعۃ لقد اعطی بھا اکثر مما اعطی وھو کاذب ورجل حلف علی یمین کاذبۃ بعد العصر لیقتطع بھا مال امرئ مسلم ورجل منع فضل ماء فیقول اللہ یوم القیمۃ الیوم امنعک فضلی کما منعت فضل ما لم تعمل یداک[1]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین شخص ایسے ہیں جن سے قیامت کے روز اللہ تعالیٰ نہ کلام کرے گا اور نہ ان کی طرف دیکھے گا۔ ایک وہ شخص جس نے مال تجارت پر قسم کھائی کہ اس نے قیمت خرید اس سے زیادہ دی تھی جو گاہک اسے دینا چاہتا ہے حالانکہ وہ اس بیان میں جھوٹا تھا، دوسرا وہ شخص جس نے عصر کے بعد کسی مسلمان کا مال ہتھیانے کے لیے جھوٹی قسم کھائی، تیسرا وہ شخص جس نے اپنی ضرورت سے زائد پانی روک لیا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس سے کہے گا کہ آج میں اپنا فضل تم سے اسی طرح روکتا ہوں جس طرح تم نے ایک ایسی فاضل چیز روکی تھی جو تمہاری بنائی ہوئی نہ تھی۔

یہ روایت اوپر والی روایت سے کئی اعتبارات سے مختلف ہوگئی ہے۔ اس میں پہلے دونوں شخص جھوٹے حلف ہی کے مجرم بتلائے گئے ہیں جبکہ زیر بحث روایت میں صرف ایک شخص جھوٹے حلف کا مجرم ہے جبکہ دوسرا امام کی بیعت میں غداری کا مجرم بتایا گیا ہے۔ تیسرے شخص کے بارے میں یہ وضاحت اس میں نہیں کہ اس نے پانی کس سے اور کن حالات میں روکا۔ ہمارے نزدیک یہ روایت نا تمام ہے۔ اس میں وہ تفصیلات نظرانداز ہوگئی ہیں جو روایت کو سمجھنے کے لیے ضروری تھیں۔ دوسرے شخص کے بیان میں بھی کسی راوی سے تسامح ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اعمش، ابووائل اور عبداللہؓ کی سند والی اس روایت کے الفاظ اس میں ڈال دیے ہیں جو امام مسلم نے الگ روایت کی حیثیت سے کتاب الایمان باب وعید من

---

[1] (صحیح بخاری۔ کتاب التوحید)

اقتطع حق مسلم بیمین فاجرۃ بالنار اور امام بخاری نے کتاب التوحید میں بیان کی ہے۔ الفاظ کی یکسانی سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے۔

وضاحت حدیث:

"اللہ تعالیٰ ان سے نہ کلام کرے گا، نہ ان کی طرف دیکھے گا"۔ ان تین اشخاص سے اللہ تعالیٰ کی نفرت اور بیزاری کی تعبیر کے لیے ہے۔ کسی کو مخاطب کرنا اور اس کی طرف توجہ کرنا محبت عنایت اور مہربانی کے لیے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لیے بڑا رؤف ورحیم ہے لیکن ان تین اشخاص کو اس کی رافت ورحمت میں سے کوئی حصہ نہ ملے گا جس کا سبب ان کا وہ کردار ہے جو آگے بیان ہوا۔ "نہ وہ ان کو پاک کرے گا" کا مفہوم یہ ہے کہ اس دن اس بات کا کوئی امکان نہ ہوگا کہ یہ لوگ اپنی اس اخلاقی کثافت کو دور کرلیں جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا باعث بنی۔ اخلاق وکردار کو سنوارنے کا مقام یہ دنیا ہے۔ جو شخص یہاں اپنی اصلاح پر قادر نہ ہوسکا۔ قیامت کے روز اس کو یہ موقع نہیں دیا جائے گا کہ وہ اصلاح پاکر خدا کو راضی کرلے۔ قرآن مجید میں یہ حقیقت بیان ہوئی ہے کہ مجرمین قیامت کے روز یہ درخواست کریں گے کہ اللہ تعالیٰ اگر ان کو ایک مرتبہ دنیا میں واپس جانے دے تو وہ اپنے گناہوں کی تلافی کرلیں گے لیکن ان کو بتایا جائے گا کہ وہ اپنی مہلتِ حیات دعمل ختم کرچکے، اپنی کھیتی میں جو کچھ بونا تھا بوچکے، قیامت کا دن صرف اعمال کی فصل اٹھانے اور اپنے کیے کا مزا چکھنے کے لیے ہے۔ چنانچہ یہ مجرمین دردناک عذاب میں مبتلا کیے جائیں گے۔

ان بدنصیب لوگوں میں پہلا شخص وہ ہوگا جس کے پاس بیابان میں اپنی ضرورت سے زائد پانی تھا لیکن کسی حاجت مند مسافر سے اس نے اسے روک لیا۔ بیابان میں بسا اوقات میلوں تک پانی میسر نہیں ہوتا۔ اگر اس کا کہیں ذخیرہ ہو بھی تو ہر مسافر یہ نہیں جانتا کہ وہ اسے کہاں سے پاسکتا ہے۔ بعض مسافر پانی کی جستجو میں سراب کے پیچھے چلتے ہوئے اپنی راہ کھو بیٹھتے ہیں اور پیاس سے ان کی جان پر بن جاتی ہے۔ اس حالت میں کوئی مسافر پانی کی تلاش میں ناکام ہوکر پیاس سے ہلکان اگر ایسے شخص کے پاس پہنچ جاتا ہے جس کے پاس اپنی ضرورت سے وافر پانی موجود ہے تو خداوند تعالیٰ کی نعمت کے شکر اور انسانی ہمدردی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس مسافر کو پانی مہیا کرے۔ اگر وہ اس کی پیاس بجھانے سے انکار کردیتا ہے تو یہ انتہائی خست، کنجوسی، خودغرضی اور سنگ دلی کی دلیل ہے۔ ایسا شخص اس بات کا مستحق نہیں کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس پر ترس کھائے۔

خدا کے غضب کا مستحق دوسرا شخص وہ ہوگا جس نے عصر کے بعد سودا بیچتے ہوئے اپنے گاہک کے سامنے جھوٹی قسم کھائی کہ مال کی قیمت خرید اس قیمت سے زیادہ ہے جتنی وہ گاہک دینے کو تیار ہے لہٰذا وہ اس

کو معقول منافع دے کر چیز خریدے۔ عصر کے بعد کا وقت بتانے میں یہ حقیقت مضمر ہے کہ یہ وقت بازار بند ہونے اور دکانیں بڑھانے کا تھا۔ گاہک اس پوزیشن میں نہ تھا کہ وہ بازار میں گھوم پھر کر صحیح نرخ کی تحقیق کر سکتا۔ دکاندار کا قسم کھانا اس بات پر دلیل ہے کہ گاہک کو اس کی بیان کردہ قیمت زیادہ معلوم ہوئی اور وہ اس پر سودا کرنے کے لیے تیار نہ تھا لیکن دکاندار نے جھوٹی قسم کھا کر اس کو آمادہ کر لیا کہ وہ مطلوبہ چیز خرید لے۔ اللہ تعالیٰ کا مقدس نام بیچ میں آجانے پر گاہک کو اطمینان ہو گیا اور اس نے منہ مانگی قیمت ادا کر دی۔

ہر دکاندار کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے سرمائے پر زیادہ سے زیادہ نفع کمائے اور ہر گاہک چاہتا ہے کہ وہ اپنی ضرورت کم سے کم قیمت پر پوری کرے۔ عام حالات میں مارکیٹ میں مقابلہ ہوتا ہے اور گاہک گھوم پھر کر موزوں قیمت کا اندازہ کر کے جائز منافع دے کر ہی چیز خریدتا ہے۔ روایت میں بیان کردہ صورت حالات میں مارکیٹ کے ان فطری عوامل کو بروئے کار نہیں آنے دیا گیا اور اس عمل کو روکنے کے لیے دکاندار نے خدا کے نام پر قسم کو بطور حربہ استعمال کیا۔ اللہ عالم الغیب والشہادہ ہے۔ وہ خود حق ہے اور باطل کو سخت ناپسند کرتا ہے۔ وہ اس لالچی اور جھوٹے دکاندار کی اس حرکت سے قیامت کے روز اپنی بیزاری کا اظہار فرمائے گا۔

خدا کے غضب کا مستحق تیسرا شخص وہ ہوگا جس نے دنیا کی خاطر امام سے بیعت کی۔ اگر یہ مقاصد پورے ہو گئے تو بیعت کے تقاضوں کو نبا ہا لیکن اگر امام کے ہاتھوں دنیا کا مفاد حاصل نہ ہوا تو بیعت کی ذمہ داریوں سے دستکش ہو گیا۔

مسلمانوں کی ریاست کا امیر ان کا امام ہوتا ہے۔ سربراہِ مملکت کی حیثیت سے جب اس کا تقرر ہوتا ہے تو وہ ریاست کے باشندوں سے اس بات کا عہد لیتا ہے کہ وہ اس کے ان احکام کو جو شریعت سے متصادم نہ ہوں گے دل و جان سے سنیں گے اور ان کی اطاعت کریں گے۔ اس عہد کا نام بیعت ہے جو شرعاً ہر مسلمان پر واجب ہے۔ یہ بیعت ریاست کی بقا، اس کے امن و امان اور ترقی و رفاہیت کے لیے ضروری ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ ہر مسلمان اپنی پوری طاقت کے مطابق اس کا حق ادا کرے۔ یہ بیعت کوئی مسلمان اپنی شرائط پر کرنے کا مجاز نہیں۔ امیر کے احکام پسند ہوں یا ناپسند، ان کی اطاعت ضروری ہوگی الا آنکہ امیر خدا کی نافرمانی کا کوئی حکم دے۔ صحاح کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

على المرء المسلم السمع والطاعة فيما احب وكره الا ان يؤمر بمعصية فان امر بمعصية فلا سمع ولا طاعة۔[1]

ہر مسلمان پر سمع و طاعت واجب ہے ہر معاملے میں جو اس کو پسند ہو یا ناپسند، الا آنکہ اسے خدا کی نافرمانی کا حکم دیا جائے۔ اگر نافرمانی کا حکم دیا جائے تو نہ سننا ضروری ہے نہ ماننا۔

اسی مضمون کو حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ یوں بیان کرتے ہیں۔

بايعنا رسول الله صلى الله عليه وسلم على السمع والطاعة في العسر واليسر والمنشط والمكره وعلى اثرة علينا۔[2]

ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سمع و طاعت پر بیعت کی، تنگی و آسودگی، خوشی و بیزاری تمام حالتوں میں اور ہم پر دوسروں سے ترجیحی سلوک کی صورت میں بھی۔

ایک ایسی شرعی ذمہ داری جس پر امت مسلمہ کی فلاح و بہبود کا انحصار ہے، اپنے دنیوی مفادات پر اس طرح قربان کر دینا کہ امیر کی اطاعت صرف اس وقت تک کی جائے جب تک اس سے مفادات وابستہ ہوں اور اگر یہ تمنا پوری نہ ہو سکے تو اس کی اطاعت کے عہد سے دست کش ہو جایا جائے، یہ ظاہر کرتا ہے کہ آدمی کو اپنی ملت اور اس کی اجتماعی بہبود سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ اپنا تشخص ملت کے حوالے سے قائم کرنے کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ وہ کسی بھی وقت اس سیاسی بنیاد ہی کو ڈھا دے سکتا ہے جس پر اسلامی ریاست کی تعمیر ہوتی ہے۔ ایسا مارِ آستین کسی بھی وقت ملت کے دشمنوں کے ہاتھوں میں بک سکتا ہے۔ جو شخص ملت سے اس قدر بے نیاز ہو اور اپنی دنیا کے پیچھے اندھا ہو رہا ہو وہ یہودی یا نصرانی ہو جائے تو بھی کوئی فرق نہ پڑے گا اور اگر اس کا انجام انہی کے ساتھ ہو تو یہ اس پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔

صورتِ واقعہ کی تفصیلات کی حیثیت:

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا حدیث کا مصداق وہی تین اشخاص ہوں گے جن کے احوال کی تفصیل الفاظِ حدیث میں کر دی گئی ہے یا اس کا اطلاق انہی جیسے اور اشخاص پر بھی ہوگا؟ ہمارے نزدیک ان تفصیلات کی حیثیت ایسی شرائط کی نہیں جن کا پورا ہونا بیان کردہ انجام سے دوچار ہونے کے لیے لازمی ہو بلکہ یہ تفصیلات صورتِ واقعہ کی تعبیر اور ان اشخاص کے کردار کے گھناؤنا پن کو واضح کرنے کے لیے بیان ہوئی ہیں۔ یہ اسلوبِ بیان قرآن مجید نے متعدد مواقع پر اختیار کیا ہے لیکن آیات کا حکم صورت واقعہ کی تفصیلات سے مجرد ہو کر نکلتا ہے۔ لہٰذا ہمارے نزدیک ہر وہ شخص اس حدیث کا مصداق ہوگا جس کے اندر وہ کردار پایا جائے گا

1۔ صحيح مسلم۔ كتاب الامارة۔ باب وجوب طاعة الامراء۔

2۔ صحيح مسلم۔ كتاب الامارة۔ باب وجوب طاعة الامراء۔

جو ان تین اشخاص کا تھا۔ مثلاً پانی مہیا نہ کرنے کے معاملہ ہی میں نہیں بلکہ قحط سالی اور ضروریات زندگی کی کمیابی کے زمانہ میں ذخیرہ اندوزی اور خلق خدا کی پریشانیوں میں اضافہ کرنے والا شخص بھی خدا کے غضب کا سامنا کرے گا۔ ہر وہ شخص جو دنیا کے چند ٹکوں کی خاطر دوسروں کا مال ہتھیانے کے لیے خدا کو حاضر وناظر کر کے جھوٹ بول دے گا یا جھوٹی اشتہار بازی کو اپنی مصنوعات کی فروخت کا ذریعہ بنائے گا، خداوند تعالیٰ قیامت کے روز اس سے بھی بیزاری ظاہر فرمائے گا اور جو شخص بھی ملت کے اجتماعی مفادات کو اپنی ذاتی اغراض کی بھینٹ چڑھا دے گا اس کا انجام بھی اس حدیث کے مطابق ہوگا۔

حدیث کا قرآن مجید سے استنباط :

روایت میں تین مجرموں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نفرت اور اظہار بیزاری کو جن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے وہ قرآن مجید کی سورہ بقرہ آیت ۱۷۴ اور سورہ آل عمران آیت ۷۷ سے لیے گئے ہیں۔ ان دونوں مواقع پر یہ یہود کا انجام بیان کرنے کے لیے وارد ہوئے ہیں۔ لہٰذا یہ نتیجہ اخذ کرنا بالکل درست ہوگا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تین اشخاص کو یہود کے کردار کا حامل قرار دیا ہے۔ حب دنیا، بخل اور سنگ دلی ہمیشہ سے یہود کے کردار کا خاصہ رہی ہیں۔ دنیا کی خاطر انہوں نے کتمان حق سے کام لیا، خدا اور بندوں کے ساتھ کیے گئے معاہدوں کو حقیر دنیوی متاع پر قربان کر دیا۔ اپنے جھوٹ پر پردہ ڈالنے کے لیے خدا کا مقدس نام استعمال کرنا ان کے ہاں معمولی بات تھی۔ ان کا بخل اور سنگ دلی تو ضرب المثل ہے اور کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی رقم کے بدلے اپنے قرض دار کا گوشت کاٹنے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ روایت میں بیان کردہ تین آدمیوں کے کردار میں یہود کے کردار کی نمایاں جھلک نظر آرہی ہے۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ کردار کی پوری پوری مطابقت کے بعد ان کا انجام یہود کے انجام سے مختلف ہو۔

یہود کی دوسری صفات کے حامل اشخاص کا انجام :

آخرت کا مذکورہ انجام اگر کردار کی خصوصیات پر مبنی ہے تو یہود کے کردار میں تو کئی دوسری باتیں بھی نمایاں ہیں تو کیا ان کی مماثلت کے باعث بھی لوگ یہود کے انجام سے دوچار ہوں گے؟ اس سوال کا جواب اثبات میں ہے۔ امام مسلم نے باب بیان الثلاثۃ ..... ہی میں دو روایات نقل کی ہیں۔ ان میں حضرت ابوذرؓ کی روایت میں جن تین شخصوں کو خدا کے غضب کا مستحق بتایا گیا ہے وہ ہیں: المسبل، المنان، المنفق سلعتہ بالحلف الکاذب۔

مسبل سے مراد وہ شخص ہے جو تفاخر کے لیے اپنا لباس اپنے قد وقامت سے بڑا رکھتا ہے اور اس کو زمین پر گھسیٹتا ہوا چلتا ہے تاکہ لوگوں کے دلوں پر اس کی امارت اور بڑائی کی دھاک بیٹھ جائے۔ ایام جاہلیت میں یہ شہدوں کا لباس ہوا کرتا تھا اور ہمارے ہاں بعض لوگ اپنی چودھراہٹ کا اظہار اسی طریقے سے کرتے ہیں۔ یہ لباس پہننے والے کے باطن کی غمازی کرتا ہے کہ وہ متکبر اور دوسروں کو حقیر سمجھنے والا ہے۔

منان وہ شخص ہوتا ہے جو کسی کو دے دلا کر یا اس کے ساتھ کوئی نیکی کر کے برابر اسے اپنا احسان جتاتا رہتا ہے۔ اس طرز عمل کے پیچھے اپنے لیے احساس برتری اور دوسروں کے لیے حقارت اور توہین کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ یہ دونوں جذبے لئیم، کم ظرف اور ناشکرے لوگوں میں ہوتے ہیں۔

تیسرا شخص اپنے مال تجارت کی فروخت کے لیے جھوٹی قسم کو ذریعہ بنانے والا ہے۔ اس کردار پر اوپر بحث ہو چکی ہے۔ اس روایت کے لحاظ سے متکبر، ناشکرے اور جھوٹی قسمیں کھانے والے طالب دنیا خدا کے غضب کا نشانہ بنیں گے۔ قرآن مجید کے مطابق کردار کے یہ پہلو بھی یہود کے اندر بہت نمایاں تھے۔

دوسری روایت میں جو حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے۔ زانی بڈھے، جھوٹے بادشاہ اور متکبر حاجت مند کو بھی خدائی نفرت کا مستحق بتایا گیا ہے۔ زانی بڈھے سے مراد وہ شخص ہے زناکاری جس کی گھٹی میں اس طرح پڑ گئی کہ بڑھاپے میں بھی جب قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں، وہ اس فعل شنیع سے باز نہ آیا۔ جھوٹے بادشاہ سے مراد وہ حکمران ہے جھوٹ بولنا جس کی عادت ثانیہ بن گئی تھی حتیٰ کہ اقتدار پا کر جب وہ ہر معاملے میں خود مختار تھا اور اسے اس بات کی قطعاً ضرورت نہ تھی کہ وہ جھوٹ کا سہارا لے، وہ اپنی اس عادت سے نجات نہ حاصل کر سکا۔ متکبر حاجت مند سے مراد اکڑ فوں رکھنے والا ایک ایسا آدمی ہے جس کے حالات کی دگرگونی نے اسے اس صورت حال میں لا ڈالا کہ وہ دوسروں سے مدد لینے پر مجبور ہو گیا لیکن پھر بھی اس کی اکڑ فوں ختم نہ ہوئی، وہ اپنے لیے برتری کا احساس رکھتا رہا۔

غور کیجیے تو ان تینوں اشخاص میں یہ بات مشترک نظر آتی ہے کہ ان کی بدخلقی ان پر اس طرح مسلط ہو گئی کہ اس نے ان کا پیچھا اس وقت بھی نہ چھوڑا جب ان کے اندر اس کا داعیہ کمزور یا بالکل ختم ہو چکا تھا۔ یہ وہ کیفیت ہے جس کے حامل لوگوں کے متعلق قرآن مجید نے اپنا فیصلہ یوں سنایا ہے:

بَلٰی مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ	ہاں جس نے کوئی بدی کمائی اور اس کے گناہ نے اس کو اپنے گھیرے میں لے لیا تو وہی لوگ دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

(البقرہ ۸۱)

اس آیت کا سیاق وسباق بتاتا ہے کہ یہ یہود کے اس دعوے کی تردید کے لیے آئی کہ دوزخ کی آگ اول تو ان کو چھوئے گی نہیں اور اگر کچھ سزا دینا ضروری ہی سمجھا گیا تو چند روز کی سزا کے بعد ان کو جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔ اس آیت میں فرمایا کہ جو شخص کسی گناہ کا عادی ہو جائے اور وہ گناہ اس کی زندگی کا احاطہ کرلے تو اس کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں دائمی عذاب ہوگا۔ یہود کے جرائم ایسے ہیں کہ انہوں نے ان کی زندگی کا احاطہ کرلیا ہے اس لیے وہ کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ ہوں، دائمی عذاب ان کا مقدر بن چکا ہے۔ گویا حضرت ابوہریرہؓ کی اس روایت میں بیان کردہ تین اشخاص بھی یہود کے کردار کے اس خاص پہلو کے ساتھ مماثلت کی وجہ سے انہی کے انجام سے دوچار ہوں گے۔

خلاصہ بحث:

اوپر کی تفصیل سے معلوم ہوا کہ روایت زیر بحث کے الفاظ کے مطابق صرف تین مخصوص اشخاص ہی نہیں بلکہ ان کے مماثل کردار رکھنے والے دوسرے اشخاص بھی حدیث کا مصداق ہوں گے اور قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ان سے بیزاری ظاہر فرمائے گا۔ نیز آخرت میں معاملہ ناموں، شکلوں اور وابستگیوں کی بنا پر نہیں بلکہ طرز عمل اور اخلاق و کردار کی بنیاد پر ہونے والا ہے۔ ایک آدمی اس گروہ کا فرد قرار پائے گا جس کے کردار کا وہ حامل ہوگا لہٰذا جو لوگ اپنے کردار میں یہود کے پیروکار ہیں ان کے ساتھ وہاں وہی معاملہ ہوگا جو یہود کے لیے مقدر ہے۔ یہ وہی حقیقت ہے جس کو قرآن مجید نے سورہ تکویر کی آیت، میں بیان فرمایا ہے۔ 'وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ' (اور جب نفوس کی جوڑیں ملائی جائیں گی) یعنی نفوس کی درجہ بندی اس دن ان کے ایمان، اخلاق اور کردار کی بنیاد پر ہوگی اور وہ ایک جیسے انجام سے دوچار ہوں گے۔

آدمی کا تعلق
اپنے کنبہ اور بیوی بچوں کے ساتھ

انسان، جیسا کہ پچھلی فصل میں واضح ہو چکا ہے، مدنی الطبع ہے اس وجہ سے اس کے لیے ترک اور تیاگ، زہد اور انقطاع کی وہ زندگی جس کا تصور فلسفۂ رہبانیت میں پیش کیا گیا ہے بالکل خلاف فطرت ہے۔ مرد یا عورت جو بھی یہ زندگی اختیار کرے گا اس سے تربیت و اصلاح کی بجائے اس کو شدید نقصان پہنچے گا۔ ہم پیچھے عرض کر چکے ہیں کہ انسان کی صلاحیتیں خاندان اور معاشرے کے سہارے پروان چڑھتی ہیں۔ اگر کسی داخلی یا خارجی سبب سے یہ سہارا اس کو حاصل نہ ہو سکے تو یہ سکڑ کے رہ جائیں گی۔ اگر مرد بیوی بچوں سے محروم ہو تو وہ ایک خانہ بدوش بن کر رہ جاتا ہے۔ اگر عورت شوہر سے محروم ہو تو وہ ایک اجڑے ہوئے گھر کے مانند ہے۔ یہ حقیقت بھی یہاں پیش نظر رکھیے کہ جو چیز صرف کنبہ اور خاندان سے حاصل ہو سکتی ہے اس کا کسی مدرسہ یا خانقاہ سے حاصل ہونا ناممکن ہے۔

ممکن ہے یہاں کسی کو یہ شبہ ہو کہ سیدنا یحییٰؑ اور سیدنا مسیحؑ کے کامل العیار انسان ہونے میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہو سکتی، لیکن معلوم ہے کہ ان جلیل القدر نبیوں نے عمر بھر تاہل کی زندگی اختیار نہیں کی۔ ہمارے نزدیک یہ شبہ بالکل بے بنیاد ہے۔ ان بزرگ نبیوں نے یہ زندگی اپنی پسند سے، مثالی زندگی سمجھ کر نہیں اختیار کی، بلکہ ان کے دور کے حالات ہی ایسے تھے کہ یہ زندگی ان کو اختیار کرنی پڑی۔ یہ دور وہ دور ہے جب بنی اسرائیل کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا تھا۔ خود ان نبیوں کے ارشادات کے مطابق یروشلم کی جڑوں پر کلہاڑا رکھا ہوا تھا اور اس کو خطاب کر کے یہ پیشین گوئی کی جا چکی تھی کہ یہاں کوئی اینٹ بھی دوسری اینٹ پر قائم نہیں رہنے دی جائے گی۔ ایسے پرآشوب حالات میں گھر در بنانے اور بیوی بچوں کی زندگی اختیار کرنے کا شوق صرف وہی پورا کر سکتے تھے جو بالکل بے فکرے اور عاقبت سے بے پرواہ ہوں۔ اس دور میں حضرت یحییٰؑ کی زندگی اس طرح گزر رہی تھی کہ وہ یا تو جیل میں ہوتے یا بیت المقدس میں یہودی خونخواروں کے نرغے

میں۔ اسی طرح سیدنا مسیحؑ شب میں جبلِ زیتون پر دعا اور آہ وزاری میں مصروف رہتے اور دن میں فریسیوں اور فقیہوں کے حصار میں مصروفِ مناظرہ۔ یہی دور ہے جس میں سیدنا مسیحؑ نے یروشلم کو مخاطب کرکے فرمایا کہ میں نے کتنا چاہا کہ تجھ کو خدا کے عذاب سے بچانے کے لیے اُس طرح اپنے بازوؤں کے نیچے چھپا لوں جس طرح مرغی کسی خطرے کی آہٹ پاکر اپنے بچوں کو اپنے پروں کے نیچے چھپا لیتی ہے، پر تُو نے نہیں چاہا۔ غور کیجیے کہ جس کا پورا گلستاں عذاب کی برقِ خرمن سوز کی زد میں ہو وہ آشیانہ بنانا چاہے بھی تو کون سی شاخ ہے جس کو وہ اس مقصد کے لیے انتخاب کرسکتا ہے! شاید یہی صورت حال ہے جس کا اظہار سیدنا مسیحؑ نے ان دلدوز الفاظ میں فرمایا کہ "بھیڑیوں کے لیے بھٹ ہیں اور سانپوں کے بل، پر ابنِ آدم کے لیے سر چھپانے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔"

بہرحال گھر در بنانا اور بیوی بچوں والا بننا کوئی دنیاداری نہیں ہے، بلکہ خالق کے منشائے تخلیقِ انسان کی مضمر صلاحیتوں کے ابراز اور اس کی تکمیلِ ذات کے لیے یہ فطرت کے بدیہی مطالبات میں سے ہے۔ جنہوں نے اس کی مخالفت کی ہے انہوں نے فطرت سے جنگ کی ہے۔ مرد اور عورت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہ دونوں مل کر ایک کنبہ کی بنیاد رکھتے ہیں جس کو انسانی معاشرہ کی تعمیر میں ایک یونٹ کی حیثیت حاصل ہے اور پھر بہت سے یونٹ مل کر ریاست کو وجود میں لاتے ہیں جو تمام تہذیب و تمدن کی معمار بنتی ہے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ یہ پہلی اینٹ بالکل ٹھیک رکھی جائے تاکہ پوری عمارت بالکل ٹھیک بنے۔ اگر اس میں کجی رہ جائے تو اندیشہ ہے کہ پوری عمارت کج ہوجائے۔ کسی نے کہا ہے:

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

اس کنبہ کی سربراہی یا قوامیت کی ذمہ داری فطرت اور شریعت نے مرد پر ڈالی ہے، اس لیے کہ مرد ہی اپنی صلاحیتوں اور مزاجی خصوصیات کے اعتبار سے اس ذمہ داری کے اٹھانے کے لیے موزوں ہے۔ قرآن میں یہ حقیقت یوں واضح فرمائی گئی ہے:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا
فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى
بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ
اَمْوَالِهِمْ ؕ
(النساء — ۴ : ۳۴)

مرد عورتوں کے سرپرست ہیں، بوجہ اس کے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت بخشی ہے اور بوجہ اس کے کہ انہوں نے اپنے مال خرچ کیے۔

اس آیت سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ کنبہ کی پرورش اور اس کی حفاظت و مدافعت بہتر طریقہ پر مرد ہی کرسکتا ہے اس وجہ سے وہی موزوں ہے کہ اس پر قوامیت کا بوجھ ڈالا جائے۔ یہ مرد کی مطلق فضیلت کا بیان نہیں، بلکہ قوامیت کی ذمہ داری کے سبب، عورت کے مقابل میں، مرد کی ترجیح کا بیان ہے۔ ہوسکتا ہے کہ بعض دوسرے اعتبارات سے عورت کو مرد پر ترجیح حاصل ہو۔ مثلاً گھر گرہستی کی ذمہ داریاں جس خوبی سے عورت سنبھال سکتی ہے اور بچوں کی دیکھ بھال جس اعلیٰ پیمانہ پر وہ کرسکتی ہے کسی مرد سے متعلق اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا درآنحالیکہ کنبہ کے مقاصد میں ان چیزوں کی اہمیت بھی بنیادی ہے۔ یہاں یہ امر بھی ملحوظ رکھیے کہ یہ بات مردوں اور عورتوں کی مزاجی خصوصیات کے اعتبار سے بطور ایک کلیہ ارشاد ہوئی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی عورت ایک مرد کے مقابل میں کمانے اور کنبہ کی کفالت کی زیادہ صلاحیت رکھنے والی ہو اور اس کے مقابل میں مرد اس صلاحیت سے عاری ہو لیکن اس طرح کی انفرادی مثالوں سے کوئی کلیہ نہیں ٹوٹ جائے گا۔ اصل سوال مردوں اور عورتوں کی فطری صلاحیتوں قوتوں اور طبعی رجحانات و میلانات کا ہے۔ کوئی انصاف پسند یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس میدان میں مرد اور عورت، دونوں یکساں صلاحیت کے مالک ہیں۔ جدید تہذیب نے عورتوں کو مرد بنانے کی کوشش پر اپنا پورا زور صرف کر ڈالا ہے، لیکن اس کوشش میں اگر کوئی کامیابی حاصل ہوئی بھی ہے تو وہ اس سے زیادہ نہیں ہے کہ بعض عورتیں اپنے تمام نسوانی اوصاف و فرائض سے کلیتہً دست بردار ہوجانے کے بعد کسی حد تک مردوں کی نقالی کرنے میں کامیاب ہوگئی ہیں۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ سودا نہ ان عورتوں کے لیے نفع بخش ہوا ہے نہ مجموعی طور پر معاشرہ اور ملک کی حکومت کے لیے۔ چند مصنوعی مردوں کے بدلہ میں بہت سی حقیقی عورتوں کو کھو بیٹھنا کوئی دانش مندی کا کام ہرگز نہیں ہے۔

قوامیت کی ذمہ داریاں اور فرائض:

اب آئیے دیکھیے کہ قوامیت کے فرائض اور اس کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ بظاہر تو یہ مرد کے سر پر شرف کا ایک تاج ہے، لیکن اس کے ساتھ جو فرائض وابستہ ہیں ان پر نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ یہ تاج ہے تو سہی، لیکن کانٹوں کا تاج ہے اس لیے کہ مرد اگر اس کا حق ادا نہیں کرسکے تو یہ اس کے لیے دنیا اور آخرت، دونوں میں رسوائی کا باعث ہوسکتا ہے۔ یہاں ہم ان فرائض اور ذمہ داریوں کا، ایک مناسب ترتیب سے ذکر کرتے ہیں اور یہ توقع رکھتے ہیں کہ آپ ان کا مطالعہ دوسروں کے فرائض کی حیثیت سے نہیں، بلکہ اپنے فرائض کی حیثیت سے کریں گے۔

پرورش اور کفالت:

بیوی بچوں سے متعلق سب سے پہلی ذمہ داری تو مرد پر ان کی پرورش اور کفالت کی عائد ہوتی ہے۔ اوپر قوامیت والی آیت جو گزری ہے اس میں 'بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ' (بوجہ اس کے کہ انھوں نے اپنے مال خرچ کیے) کے الفاظ صاف دلیل ہیں کہ مرد کو عورت پر جو قوامیت حاصل ہوئی ہے اس کے دو سببوں میں سے ایک بڑا سبب یہی ہے کہ وہ بیوی بچوں کی کفالت کا بار اٹھاتا ہے۔ یہ بار اٹھانا مرد کی مردانگی اور فتوت کا تقاضا ہے۔ قرآن نے مردوں کو عورت کے ساتھ معاملہ کرنے میں اپنی فتوت کی لاج رکھنے کی جگہ جگہ ہدایت فرمائی ہے۔ مثلاً مردوں کو خطاب کر کے فرمایا ہے کہ 'وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ' (البقرة - ۲ : ۲۳۷) (اور تمہارے درمیان ایک کو دوسرے پر جو فضیلت ہے اس کو نہ بھولو)۔ یعنی اس ترجیح کا تقاضا یہ ہے کہ مرد عورت سے لینے والا نہ بنے، بلکہ اس کی رجولیت کا تقاضا ہے کہ وہ اس کو دینے والا بنے۔ چنانچہ ہر معاشرے میں وہ مرد نکمّا سمجھا جاتا ہے جو اپنی محنت سے اپنے بیوی بچوں کی کفالت نہ کر سکے اور اس بات کا تو مجبور کن حالات کے سوا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی مرد عورت کی کمائی پر تکیہ کرنے والا بنے۔

یہاں ایک نہایت اہم حقیقت یہ بھی ملحوظ رکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد پر بیوی بچوں کی کفالت کی ذمہ داری تو ڈالی ہے، لیکن اس کو ان کا رزاق نہیں بنایا ہے کہ وہ ان کے مسائل پر اس پہلو سے سوچنا شروع کر دے کہ اس کے پاس کتنے بچوں کی کفالت کی گنجائش ہے، کتنے اس کی تحویل میں آ چکے ہیں اور اب کسی نووارد کے لیے اس کے ہاں جگہ ہے یا نہیں؛ اس طرح کے سوالات پر غور کرنے والے جس طرح اپنے معیار زندگی اور اپنی آمدنی کو سامنے رکھ کر اپنے گھر کے بجٹ بناتے ہیں اسی طرح بچوں کی پیدائش سے متعلق بھی پروگرام بناتے ہیں۔ اگر ان کو اندیشہ ہوتا ہے کہ کوئی نومولود آ کر ان کے بجٹ میں رخنہ انداز ہو سکتا ہے تو وہ اس کو روکنے کے لیے منع حمل اور اسقاط کے اسلحہ اور گولہ بارود لے کر میدان میں اتر آتے ہیں۔ قرآن حکیم نے اس طرح کے بوالفضولوں کو خطاب کر کے متنبہ کیا ہے کہ کسی کنبہ کے سرپرست کو کبھی اس غلط فہمی میں نہیں مبتلا ہونا چاہیے کہ وہ ان کا رزاق ہے۔ ان کا رزاق ہونا تو درکنار کوئی اپنا بھی رزاق نہیں ہے۔ رزاق سب کا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ — اور اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو۔
نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ — ہم ہی تم کو بھی روزی دیتے ہیں اور ان کو بھی۔
(الانعام - ۶ : ۱۵۱)

اس آیت میں خطاب ان لوگوں سے ہے جو معاشی تنگ حالی کے ڈر سے بعض اوقات اپنی اولاد خاص طور پر لڑکیوں کو، زندہ درگور کر دیتے تھے۔ ان کو خطاب کر کے فرمایا کہ تم صرف خدا کے بخشے ہوئے رزق کو تقسیم کرنے والے ہو، رزاق نہیں ہو کہ کسی کی زندگی یا اس کے رزق کو ختم کر دینے کا فیصلہ کرو۔ یہ فیصلہ رزاق حقیقی کا کام ہے جو سب کو رزق دیتا ہے۔

آیت کا مدعا یہ ہے کہ آدمی وہ کام کرے جو اس کے حدود کار کے اندر اور اس کے فرائض میں شامل ہیں: کسب رزق کے لیے جدوجہد کرے، وسائل کو ترقی دے، حاصل شدہ رزق کو کفایت شعاری اور انصاف کے ساتھ تقسیم کرے۔ اسی طرح بچوں کی پیدائش کے معاملہ میں صحت، اعتدال، احتیاط اور میانہ روی کو ملحوظ رکھے۔ یہ کام اس کے کرنے کے ہیں۔ رہی یہ بات کہ کتنے بچے پیدا ہوں گے اور کتنا رزق حاصل ہوگا، یہ خدا کے کرنے کے کام ہیں۔ ان میں مداخلت کرنے والے احمق ہیں۔

کفالت کے باب میں اللہ تعالیٰ اور اس کے نبیوں کی ہدایت یہ بھی ہے کہ یہ کسب حلال سے ہو۔ کسب حرام سے جو کنبہ پلتا ہے وہ دنیا میں ممکن ہے کچھ چمک دمک دکھا جائے، لیکن بالآخر اس کے مقدر میں ایسی تباہی ہے جس سے کبھی نجات ملنے والی نہیں ہے۔ آخرت میں اس کے سارے افراد ایک دوسرے پر لعنت کے دونگڑے برسائیں گے۔ ایسے کنبہ سے کسی رجل رشید کے پیدا ہونے کی توقع نہیں ہوتی۔ اگر کبھی آزر کے گھر میں کوئی ابراہیم تقدیر سے پیدا ہو جاتا ہے تو وہ اس بت خانہ کو منہدم کر کے لازماً دوسرا معبد تعمیر کرتا ہے لیکن ایسا کم ہی ہوتا ہے۔

اگر کسب حرام کی وبا کسی قوم میں عام ہو جائے تو وہ لازماً عذاب الٰہی کی پکڑ میں آ جاتی ہے۔ قرآن میں قوم شعیب کی تباہی اسی جرم میں بیان ہوئی ہے۔ اس زمانے میں چونکہ یہ وبا عالم گیر ہو چکی ہے اس وجہ سے صورت حال کچھ ایسی نظر آ رہی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ پوری دنیا یک قلم تباہ ہو جائے گی۔ یہودیانہ سرمایہ داری نے کمیونزم کا ایسا سرطان پیدا کر دیا ہے جس کا علاج اسلام کے سوا کسی کے پاس نہیں ہے، لیکن اسلام ملا کے ہاتھ میں اسیر ہے۔ اور اس کے نام لیوا نہ دنیا سے واقف نظر آتے ہیں، نہ دین سے۔

اس کفالت سے متعلق قرآن کی یہ ہدایت بھی یاد رکھیے کہ لازم ہے کہ اس میں نہ بخل ہو نہ تبذیر، بلکہ ہر پہلو سے یہ کفایت شعاری اور میانہ روی کا مظہر ہو۔ یہ اس وجہ سے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کے رزق میں کشادگی بخشتا ہے اس کے اندر دوسرے مستحقین کے حقوق بھی ہوتے ہیں جو بطور امانت اس کی تحویل میں دیے جاتے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ جو فرمایا گیا ہے: 'وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ' (المعارج - ۷۰ : ۲۴-۲۵) (اور وہ جن کے مالوں میں ایک معین حق ہے،

بے سائلوں اور محروموں کا، اس سے اسی حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ ظاہر ہے کہ اس حق کو حق کی حیثیت سے ادا کرنے کی توفیق وہی پا سکتا ہے جو اپنے اور اپنے بیوی بچوں کے مصارف میں محتاط اور کفایت شعار ہوگا ورنہ وہ اپنے ہی شوق پورے نہ کر پائے گا تو دوسروں کے حقوق کا کیا خیال کرے گا جب ان کی جانب سے اس کو کسی مطالبہ کا اندیشہ بھی نہیں ہے۔ لیکن یہ ملحوظ رہے کہ مطلوب صرف کفایت اور میانہ روی ہے، یہ ہرگز مقصود نہیں ہے کہ رزق کی کشادگی ہوتے آدمی بیوی بچوں کے ساتھ بخالت اور کنجوسی کی روش اختیار کرے۔ اللہ تعالیٰ بندے کو جب رزق کی کشادگی سے نوازے تو وہ چاہتا ہے کہ اس نعمت کا اثر اس کے دل کی شکرگزاری سے بھی ظاہر ہو اور اس کی زندگی سے بھی نمایاں ہو۔ کسی خوش حال آدمی کے بچے اگر پھٹے حال میں سامنے آئیں تو یا تو اس پر کنجوسی کا گمان ہوتا ہے یا بے سلیقگی کا اور یہ گمان پیدا ہونے کا موقع دینا ہرگز کوئی پسندیدہ بات نہیں ہے۔

تعلیم و تربیت :

دوسری بڑی ذمہ داری جو پہلی ذمہ داری سے کسی طرح کم نہیں ہے وہ بیوی بچوں کی تعلیم و تربیت ہے۔ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ بچے کی اصل اور ابتدائی تربیت گاہ ماں باپ کی آغوش ہے۔ اس دور میں جو نقوش اس کی لوحِ قلب پر قائم ہو جاتے ہیں، خواہ وہ اچھے ہوں یا برے، وہ انمٹ ہوتے ہیں۔ یہ جو فرمایا گیا ہے کہ "مامن مولود الا یولد علی الفطرۃ فابواہ یہودانہ وینصرانہ ویمجسانہ"[1] (ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، یہ ماں باپ ہیں جو اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں) ایک عظیم حقیقت کا اظہار ہے۔ ایک مرد کے لیے شادی کر لینا کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے، لیکن یہ بہت بڑا مسئلہ ہے کہ پیدا ہونے والے بچے اپنی بالکل ابتدائی تربیت گاہ میں ایسی تربیت کس طرح پائیں کہ ان کی فطرت نہ صرف یہ کہ مسخ ہونے سے محفوظ رہے، بلکہ وہ ٹھیک اس نہج پر پروان چڑھے جو اس کا فطری نہج ہے۔

یہ مسئلہ دوسروں کے لیے کچھ اہمیت رکھنے والا ہو یا نہ ہو، لیکن مسلمانوں کے لیے یہ نہایت اہم ہے، بالخصوص اس زمانے میں جب کہ معاشرے کا مزاج بالکل فاسقانہ ہے اور تعلیم و تربیت کے تمام ادارے بلا استثناء اتنے بگڑ چکے ہیں کہ ان کی نسبت اگر یہ کہا جائے تو ذرا غلط نہیں ہے کہ وہ زیر تربیت نسل کو شرارتوں میں کچھ چالاک تو بنا دیتے ہیں، لیکن دین اور اخلاق کو بالکل برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔ اس معاشرہ

[1] صحیح مسلم: کتاب القدر، باب ۶

کی اصلاح ہوگی یا نہیں؟ ہوگی تو کب ہوگی؟ تعلیمی اور تبلیغی نظام بدلے گا یا نہیں؟ بدلے گا تو کب؟ ان سوالوں کا جواب دینا میرا کام نہیں ہے۔ اگر یہ بدلے گا بھی تو ابھی اس میں اتنی دیر ہے کہ تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود۔ اس وجہ سے یہ سوچنا ضروری ہے کہ فوری طور پر ہر دردمند مسلمان اور ہر مسلمان کنبہ کا سربراہ، اپنے طور پر اپنی موجودہ نسل کے دین و ایمان کے بچانے کے لیے کیا کوشش کر سکتا ہے۔ اپنے موضوع کے لحاظ سے بھی مجھے اپنے آپ کو اسی سوال تک محدود رکھنا چاہیے اس لیے کہ میں یہاں تعلیم و تربیت کے نظام کی اصلاح کے مسئلہ پر بحث نہیں کر رہا ہوں، بلکہ یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہر کنبے کے سربراہ کی ذمہ داری اس کے بیوی بچوں سے متعلق کیا ہے؟

اس کا جواب میرے نزدیک یہ ہے کہ اس بگڑے ہوئے زمانے میں کوئی شخص کچھ اور کر سکے یا نہ کر سکے، لیکن ہر شخص پر واجب ہے کہ وہ اپنے امکان اور صلاحیت کے حد تک اپنے بیوی بچوں کو جہنم کی آگ سے بچانے کی کوشش کرے۔ یہ تو ممکن نہیں کہ معاشرے کو چھوڑ کر کہیں بھاگ جائے۔ کوئی بھاگنا چاہے بھی تو آخر کہاں جائے گا؟ اب وہ ہوا کتنی ہی فاسد ہو چکی ہو، لیکن اسی میں جینا اور اسی میں مرنا ہے۔ موجود تعلیمی اور تربیتی اداروں سے بھی مفر نہیں ہے۔ اس لیے کہ ادارے قائم کرنا افراد کا کام نہیں ہے، معاشرہ اور حکومت کا کام ہے اور وہ اپنے مزاج کے مطابق ہی ادارے قائم کر سکتے ہیں۔ ایسے حالات میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہر دردمند سربراہِ کنبہ ایک طرف معاشرہ کی اصلاح کے لیے جدوجہد کرے ——— جس پر میں اگلی فصل میں بحث کروں گا ——— دوسری طرف یہ بھی ضروری ہے کہ وہ بیوی بچوں کو پوری دل سوزی و دردمندی کے ساتھ ان باتوں کی یاد دہانی کرتا رہے جو ایمان کو زندہ رکھنے والی ہیں تاکہ وہ عند اللہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو سکے۔ اس فرض کا صحیح احساس اپنے اندر زندہ رکھنے کے لیے مندرجہ ذیل باتوں پر ہر شخص کو نگاہ رکھنی چاہیے۔

گلہ کی حفاظت :

پہلی یہ کہ "الا کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ"[1] (آگاہ رہو کہ تم میں سے ہر شخص چرواہا بنا دیا گیا ہے اور ہر ایک سے اس کے گلہ سے متعلق پرسش ہونی ہے) میں یہ آگاہی دی گئی ہے کہ ہر شخص کے بیوی بچے اس کی تحویل میں دیے ہوئے گلہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس گلہ کا اصل مالک تو اللہ تعالیٰ ہی

[1] صحیح مسلم: کتاب الامارۃ، باب ۵

ہے، لیکن اس کی نگرانی، اس کی چرواہی اور اس کی حفاظت اس نے سربراہِ کنبہ کے سپرد کی ہے اور ایک دن ــــ قیامت کے دن ــــ وہ دیکھے گا کہ کس نے اپنا فرض ادا کیا ہے اور کس نے ادائے فرض میں کوتاہی کی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ کسی کا اپنا گلہ نہیں ہے کہ چاہے وہ اس کی دیکھ بھال کرے یا نہ کرے، بلکہ یہ خالق و مالک کا گلہ ہے اس وجہ سے ضروری ہے کہ پوری مستعدی سے اس کی نگرانی کی جائے اور ٹھیک ٹھیک اس کے منشاء کے مطابق کی جائے۔ اگر اس میں ذرا بھی کوتاہی ہوئی اور غفلت کے باعث کوئی بھیڑ کھوئی گئی یا وہ بھیڑیے کے ہتھے چڑھ گئی تو اس کے لیے وہ لازماً مسئول ہوگا۔ یہ بات بھی یہاں یاد رکھیے کہ یہ معاملہ حیوانی گلہ کا نہیں، بلکہ انسانی گلہ کا ہے جس کا سب سے بڑا دشمن شیطان ہے جس سے بچنے اور بچانے کی تاکید اللہ تعالیٰ نے سب سے زیادہ کی ہے اس وجہ سے ہر سربراہِ کنبہ پر سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے گلہ کو اس دشمن کی شب خونی سے بچانے کے لیے چوکنا رہے۔

مستقبل سے متعلق فکرمندی :

دوسری یہ کہ ہر شخص کو یہ حقیقت ہر لحہ پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ اولاد کے ساتھ محبت اور شفقت یہ نہیں ہے کہ اس کو غلط روی کے لیے ڈھیل دی جائے، بلکہ یہ ہے کہ روزِ اول سے اس کی ایسی باتوں پر جو کسی غلط رجحان کی نشان دہی کرتی ہوں، نہایت شفقت اور پیار کے ساتھ ٹوکا جاتا رہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ اخلاق، آداب اور شریعت کے بنیادی احکام اس کے کانوں میں نہایت شفقت کے ساتھ اس طرح ڈالے جائیں کہ وہ بار نہ محسوس کرے۔ اس کا خیال نہ کیا جائے کہ وہ ان پر عمل کرتا ہے یا نہیں اس سے قطع نظر کرکے ضروری باتیں مناسب مواقع سے برابر اس کے کانوں میں پڑتی رہیں البتہ کہنے والے اس امر کا اہتمام رکھیں کہ خود اُن سے ان باتوں میں سے کسی بات کی خلاف ورزی صادر نہ ہو۔ انسان کی فطرت ایسی ہے کہ شفقت اور پیار کے ساتھ جو بات بتائی اور سکھائی جاتی ہے وہ ضرور اثر کرتی ہے بشرطیکہ عمل کا تسلسل جاری رہے اور تحکم و جبر سے احتراز کیا جائے جو لوگ اپنی اولاد کی تربیت کے لیے یہ ریاضت کریں گے امید ہے کہ وہ اس برے زمانے میں بھی اس کو اس قابل بنالیں گے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کو وہ خوشی نصیب کرے جس کا ذکر سورۂ طور میں ہوا ہے۔ فرمایا ہے :

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ (الطور - ۵۲ : ۲۱)	اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے بھی ایمان کے ساتھ ان کی پیروی کی ان کے ساتھ ہم ان کی اولاد کو بھی جمع کریں گے اور ان کے عمل میں سے ذرا بھی کمی نہیں کریں گے۔

مطلب یہ ہے کہ اونچے درجہ کے اہلِ ایمان پر اللہ تعالیٰ یہ فضل فرمائے گا کہ ان کی باایمان اولاد کو ان کے بلند درجے میں ان کے ساتھ اکٹھا کردے گا، اگرچہ اولاد اپنے عمل کے اعتبار سے اس درجہ کی سزاوار نہ ہو۔ یہ ان لوگوں پر خاص فضل ہوگا اور اس فضلِ خاص کی وجہ خود انہی کی زبانی یہ بیان ہوئی ہے کہ جب ان سے پوچھا جائے گا کہ یہ مرتبہ آپ لوگوں کو کس طرح حاصل ہوا کہ آپ کی اولاد بھی آپ کے ساتھ جمع کردی گئی تو وہ جواب دیں گے :

قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ ۝ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ۝ (الطور - ۵۲ : ۲۷)	وہ کہیں گے کہ ہم اس سے پہلے اپنے اہل و عیال کے باب میں بڑے ہی چوکنے رہے ہیں تو اللہ نے ہم پر اپنا فضل فرمایا اور ہمیں عذابِ دوزخ سے محفوظ رکھا۔

مطلب یہ ہے کہ ہم نے اپنے بیوی بچوں کی عاقبت سے کبھی بے فکر رہ کر زندگی نہیں گزاری، بلکہ ہمیشہ خود بھی چوکنے رہے اور برابر ان کو بھی چوکنے رکھنے کی کوشش کی، یہ اس کا صلہ ہے کہ آج ہم کو اور ہماری اولاد کو یکجا کردیا گیا ہے اور اس یکجائی کے لیے ہمارا درجہ نیچا نہیں کیا گیا، بلکہ ربِ کریم نے اپنے فضلِ خاص سے ان کا درجہ ہمارے برابر کردیا یہ اس کا فضل ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ اپنے اہل و عیال کی عاقبت کی طرف سے بالکل بےفکر اور لاابالیانہ زندگی گزارتے ہیں خواہ اپنی بلادت کے سبب سے یا اپنے زعم میں یہ خیال کیے بیٹھے ہیں کہ اس عمر میں وہ ان کی آزادی اور بےفکری میں کیوں خلل انداز ہوں وہ اپنی اولاد کے ساتھ وہ دشمنی کر رہے ہیں جو کوئی بڑے سے بڑا دشمن بھی نہیں کرسکتا اور ان کے اس رویہ پر سب سے زیادہ ان پر لعنت ان کی اولاد کرے گی اگرچہ یہ سب کچھ بالکل بعد از وقت ہوگا جس کا نفع کچھ نہیں ہوگا۔

بال سے زیادہ باریک، تلوار سے زیادہ تیز راہ :

تیسری یہ کہ ہر شخص کو یہ حقیقت ہر لحہ پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ بیوی بچے آدمی کے لیے صرف نعمت

ہی نہیں، بلکہ بہت بڑی آزمائش بھی ہیں۔ ان کو پا کر جس طرح آدمی اس دنیا کی سب سے بڑی خوشی پا لیتا ہے اسی طرح وہ ان کی صورت میں آخرت کے لیے بہت بڑا خطرہ بھی مول لے لیتا ہے اگر وہ ان کے اندر گم ہو کے رہ جائے اور ان خطرات و مہالک کا صحیح صحیح اندازہ نہ کر سکے جو ان سے اس کو پہنچ سکتے ہیں۔ ان کے ساتھ معاملہ کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ نہایت کٹھن ذمہ داری ہے۔ اس کو صحیح طور پر وہی انجام دے سکتے ہیں جن کو توفیقِ الٰہی کا خاص بدرقہ حاصل ہو اور جو محبت اور نفرت، دونوں کے اندر حدودِ الٰہی کا احترام قائم رکھنے کا علم اور حوصلہ رکھتے ہوں۔ سورۂ تغابن کی یہ آیات ملاحظہ ہوں:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۞ اِنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۗ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۞

اے ایمان والو! تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے لیے دشمن ہیں تو ان سے بچ کے رہو اور اگر تم معاف کرو گے، درگزر کرو گے اور بخشو گے تو اللہ غفور رحیم ہے۔ تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہارے لیے امتحان ہیں اور اللہ کے پاس بہت بڑا اجر ہے۔

(التغابن - ۶۴ : ۱۴ - ۱۵)

ان آیات سے واضح ہے کہ بیوی بچے آدمی کے لیے نعمت ہی نعمت نہیں ہیں، بلکہ وہ دشمن اور بہت بڑا فتنہ بھی اس کے لیے ہیں۔ غور کیجیے کہ ان کے دشمن ہونے کی صورت کیا ہو سکتی ہے؟ اس کا صحیح جواب یہی ہو سکتا ہے کہ اگر وہ اس کو اپنے دامِ محبت میں اس طرح گرفتار کر لیں کہ وہ ان کی دل داری میں نہ خدا کے حدود، حرام و حلال کی کوئی پروا کرے نہ دوسروں کے حقوق و فرائض کا اس کو کچھ احساس رہ جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کے بیوی بچوں نے اس کو اپنے دامِ محبت میں پھنسا کر ہلاکت کی اس راہ پر ڈال دیا جس پر اس کا کوئی بڑے سے بڑا دشمن بھی نہیں ڈال سکتا تھا۔ پھر اس سے زیادہ نازک پہلو اس کا یہ ہے کہ اگر وہ ان کو دشمن سمجھ کر ان کے ساتھ وہ معاملہ کرے جو دشمن کے ساتھ کیا جاتا ہے، یعنی ان کو کاٹ پھینکے تو یہ بھی کوئی سہل بازی نہیں ہے۔ اس صورت میں اس کا اپنا گھر اجڑتا ہے اور آدمی ایسے جال میں پھنستا ہے جس سے نہ صرف اس کی بلکہ اس کی بیوی بچوں اور عزیزوں، سب کی زندگی مستقل غم و الم کی نذر ہو کر رہ جاتی ہے: نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن! اگر بیوی بچوں کی خواہشوں کی تکمیل کرے تو مشکل اور اگر ان کو کاٹ پھینکنے کا ارادہ کرے تو مشکل! بیچ کی راہ صرف یہ معلوم ہوتی ہے کہ بیوی بچوں کی غلط خواہشوں کی تکمیل سے تو اسے بہرحال انکار کرنا ہے اس لیے کہ ان کی خوشی کے لیے خدا کے غضب کو مول نہیں لیا جا سکتا،

رہی بیوی بچوں کی برہمی تو جس حد تک ممکن ہو سکے ان سے درگزر کرے اور نباہ کرنے کی کوشش کرے، کوئی سخت قدم اس وقت تک نہ اٹھائے جب تک وہ یہ فیصلہ نہ کر لے کہ خدا اور ان کو بیک وقت راضی رکھنا ممکن نہیں رہا۔ آیات پر اچھی طرح غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان کا منشا یہی ہے کہ بندہ یہی راہ اختیار کرے، لیکن کیا یہ راہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز نہیں ہے! لاریب یہ راہ ایسی ہی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کو پسند یہی ہے کہ بندہ بیوی بچوں کے معاملہ میں اس راہ پر چلنے کا امتحان پاس کرے:

ہشدار کہ راہ بردمِ تیغ است قدم را!

یہاں ایک تفسیری نکتہ یہ بھی یاد رکھیے کہ سورۂ تغابن کے بعد سورۂ طلاق اور سورۂ تحریم جو آئی ہیں قرآن میں بالترتیب یہ حقیقت سمجھائی گئی ہے کہ زندگی کے ناگوار حالات کے اندر بندے کو کس طرح اللہ تعالیٰ کے حدود کا احترام ملحوظ رکھنا چاہیے اور خوشگوار حالات میں کس طرح ان کی پابندی کرنی چاہیے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں ہی حالتیں آدمی کے لیے مزلۂ قدم بنتی ہیں۔ محبت بھی آدمی کو اندھا بنا دیتی ہے اور نفرت بھی۔ مبارک ہے وہ بندہ جو ان دونوں سے عہدہ برآ ہو سکے۔

نصیحت اور وصیت:

چوتھی یہ کہ آدمی ہر مناسب موقع پر بیوی بچوں کو نصیحت بھی کرتا رہے اور جس کو توفیق حاصل ہو وہ اپنے آخری لمحاتِ زندگی میں ان کو وصیت بھی کرے اور ان دونوں ہی چیزوں میں ان کی آخرت کی فکر مقدم رہے۔ نصیحت بھی رائگاں نہیں جاتی بشرطیکہ وہ باتیں ملحوظ رہیں جو ہم نے اوپر بیان کی ہیں اور اگر اس کا کچھ فائدہ بظاہر نہ بھی ہو تو یہ فائدہ کیا کم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ بری الذمہ قرار پائے گا۔ رہی وصیت تو وہ اکثر حالات میں مؤثر ہوتی ہے۔ اولاد میں ذرا بھی سعادت مندی کی رمق ہو تو وہ باپ کی آخری لمحاتِ زندگی میں کی ہوئی وصیت کی لاج رکھتی ہے۔ تورات اور قرآن، دونوں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حضرات انبیائے کرام اور بزرگ اسلاف میں وصیت کی روایت رہی ہے۔ قرآن میں چند اہم وصیتوں کا حوالہ ہے۔ جن میں سے حضرت لقمان کی وصیت بڑی تفصیل سے بیان ہوئی ہے۔ ہم اس کو یہاں نقل کرتے ہیں تاکہ وہ لوگوں کے لیے مثال کا کام دے:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ۗ وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ

اور ہم نے لقمان کو حکمت عطا فرمائی کہ اللہ کے شکر گزار رہو اور جو شکر گزار رہے گا تو اپنے لیے ہی رہے گا اور جو ناشکری کرے گا تو اللہ بے نیاز

كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝ وَاِذْ قَالَ
لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ
لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؔ اِنَّ الشِّرْكَ
لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۝ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ
بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا
عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ
اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ؕ
اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ۝ وَاِنْ جَاهَدٰكَ
عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ
لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا
وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا ؗ
وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ۚ
ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ
بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ
اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ
خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ
فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ
بِهَا اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ۝
يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ
بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ
وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ؕ اِنَّ
ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝ وَلَا تُصَعِّرْ
خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي
الْاَرْضِ مَرَحًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ
كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۝ وَاقْصِدْ فِيْ

ستودہ صفات ہے۔ اور یاد کرو جب کہ لقمان نے اپنے بیٹے سے، اس کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ اے میرے بیٹے! اللہ کا شریک نہ ٹھہرائیو۔ بے شک شرک ایک بہت بڑا ظلم ہے۔ اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے معاملے میں ہدایت کی۔ اس کی ماں نے دکھ پر دکھ جھیل کر اس کو پیٹ میں رکھا اور دو سال میں اس کا دودھ چھڑانا ہوا کہ میرے شکر گزار رہو اور اپنے والدین کے۔ میری ہی طرف لوٹنا ہے۔ اور اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تو کسی چیز کو میرا شریک ٹھہرا جس کے باب میں تیرے پاس کوئی دلیل نہیں تو ان کی بات نہ مانیو اور دنیا میں ان کے ساتھ نیک سلوک رکھیو۔ اور پیروی ان کے طریقہ کی کیجیو جو میری طرف متوجہ ہیں۔ پھر میری ہی طرف تمہارا لوٹنا ہے اور میں جو کچھ تم کرتے رہے ہو اس سے تم کو آگاہ کردوں گا۔ اے میرے بیٹے! کوئی عمل اگر رائی کے دانے کے برابر بھی ہوگا تو خواہ وہ کسی گھاٹی میں ہو یا آسمانوں یا زمین میں ہو اللہ اس کو حاضر کردے گا۔ بے شک اللہ نہایت ہی باریک بیں اور باخبر ہے۔ اے میرے بیٹے! نماز کا اہتمام رکھو، نیکی کا حکم دو اور برائی سے روکو اور جو مصیبت تمہیں پہنچے اس پر صبر کرو۔ بے شک یہ باتیں عزیمت کے کاموں میں سے ہیں اور لوگوں سے بے رخی نہ کر اور زمین میں اکڑ کر نہ چل۔ اللہ کسی اکڑنے والے اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ اور اپنی چال میں میانہ روی اختیار کر

باقی صفحہ ۴۸ پر

مراسلہ و مذاکرہ

امین احسن اصلاحی

قوم کے عروج وزوال میں کردار کی اہمیت

س : قوم کی تعمیر و ترقی میں اصل زور کردار پر دینا چاہیے یا اس کی مادی قوت بڑھانے پر۔ ملتِ اسلامیہ کی زبوں حالی کی اصل وجہ کیا ہے ؟

ج : قوموں کے عروج و زوال کی بحث میں جو فلسفہ عام طور پر پیش کیا جاتا ہے وہ وہی ہے جو نزولِ قرآن کے زمانہ میں قریش پیش کیا کرتے تھے یعنی یہ کہ قومیں ایک درخت کے مانند ہیں۔ درخت اگتا ہے، تناور ہوتا ہے، اپنی صلاحیت کے مطابق پھل پھول لاتا ہے، عمر طبعی گزار کر کہنہ ہو جاتا ہے۔ اس کی جڑیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں اور ہوا کا کوئی تیز جھونکا ایک دن اسے گرا دیتا ہے۔ قرآن مجید نے اپنا فلسفہ تاریخ بالکل مختلف بنیاد پر پیش کیا ہے اور وہ اس میں اکیلا ہے۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ قوموں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ درختوں کا سا نہیں۔ ان کے ساتھ معاملہ ایمانیات و عقائد اور اخلاق و کردار کی اصلاح یا ان کے فساد کے مطابق ہوتا ہے۔ ایک قوم اگر اپنے قومی و اجتماعی کردار کو پورے طریقے سے مشہود اور مبرہن کرتی ہے تو وہ پروان چڑھتی ہے۔ اس کے بعد جب اس کے کردار میں زوال شروع ہو جاتا ہے تو وہ بتدریج زوال پذیر ہو جاتی ہے یہاں تک کہ ایک دن خدا کے قانون کے تحت فنا کر دی جاتی ہے۔

قرآن مجید نے اپنے اس فلسفہ کو ثابت کرنے کے لیے ان قوموں کی تاریخ کا حوالہ دیا ہے جو اہلِ عرب کے علم میں تھیں اور ان کی طرف رسول مبعوث ہوئے تھے مثلاً قوم نوح، عاد، ثمود، اہلِ مدین، قوم لوط، قوم فرعون، وغیرہ۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ قومیں اس اصول سے مستثنیٰ ہیں جن کی طرف رسول مبعوث نہیں ہوئے۔ ان قوموں کے عروج و زوال کا قانون بھی یہی ہے البتہ اس حقیقت کو واضح کرنے والے افراد ان میں نہیں ہوتے چنانچہ جب ایک قوم زوال پذیر ہوتی ہے تو اس کے مورخین زوال کے اسباب متعین کرنے میں قومی تعصب سے کام لیتے ہیں یا فوری اور وقتی اسباب کو اصل مان کر بنیادی اخلاقی اسباب سے صرفِ نظر کر لیتے ہیں۔ اسی

طرح مخالف قوم کی فوقیت کا اعتراف کرنے میں بخل سے کام لیا جاتا ہے اور اپنی قوم کی کمزوری پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

شیخ سعدیؒ نے سقوطِ بغداد کا نہایت شاندار مرثیہ کہا ہے کہ ؎

آسماں را حق بود گر خون ببارد بر زمیں
بر زوالِ ملکِ مستعصم امیر المومنیں

لیکن کیا ہم نے اس حقیقت کو جاننے کی کوشش بھی کی کہ مستعصم کی حکومت میں کیا کیا کمزوریاں گھس آئی تھیں اور زندگی کے مختلف دوائر میں مسلمانوں نے اپنے اجتماعی و قومی فرائض سے کس طرح آنکھیں بند کر لی تھیں۔ ہم اندلس میں مسلمانوں کے زوال پر آنسو بہاتے رہے لیکن زوال سے قبل وہاں کے حکمرانوں کا اندازِ حکمرانی کیسا تھا اور قوم اپنے ملی مقاصد سے کس قدر منحرف ہو چکی تھی۔ اس کا تجزیہ کر کے ہم نے بروقت اس خطرے کا سدباب نہ کیا۔ ہندوستان میں ہم انگریزوں کو کوستے رہے کہ انہوں نے صدیوں سے قائم حکومتِ دہلی کو ختم کر کے ملک کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ لیا لیکن ہم نے یہ نہیں سوچا کہ سلطنتِ مغلیہ کے آخری تاجداروں کے روزمرہ کے مشاغل کیا تھے۔ ان کے شب و روز ملت کی کس خدمت میں بسر ہوتے تھے۔ ان کے رات رات بھر کے مشاعروں کا موضوع کیا ہوتا تھا اور کیا انہوں نے اسی جذبۂ جہاد اور نظم و ضبط کے ساتھ انگریزوں کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی جس کی نمود ہمیں اورنگ زیب عالمگیر کے ہاں ملتی ہے۔ خود انگریزوں کو دیکھئے۔ نصف صدی پیشتر یہ ساری دنیا پر اس طرح چھائے ہوئے تھے کہ کوئی شخص تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ان کا اقتدار کبھی دنیا سے ختم ہو جائے گا۔ لیکن مشاہدہ یہ ہے کہ وہ سمٹتے سمٹتے اب جزائرِ برطانیہ میں بند ہو کر رہ گئے ہیں اور قوموں کے اندر ان کا مقام اب تیسرے درجے کی اقوام کا ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ انگریزوں میں اب وہ کردار مفقود ہے جو صدی ڈیڑھ صدی پہلے ان میں نظر آتا تھا۔ اگر قوموں کے زوال کے اسباب کا تعین کرنے میں جانبداری اور بے جا تعصب سے کام نہ لیا جائے تو تاریخ کے انقلابات یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ قومی کردار کا زوال قوموں کی تباہی کا موجب ہوتا ہے اور قومی کردار کا استحکام ان کے عروج کا ضامن ہوتا ہے۔

اس بحث میں لفظ کردار بھی وضاحت طلب ہے۔ ہمارے ہاں عام تصور یہ ہے کہ ایک صاحب اگر ہاتھ میں تسبیح لے کر اللہ اللہ کرتے ہیں، کسی پیر کے مرید ہو گئے ہیں، نماز روزہ میں منہمک رہ کر زندگی گزار رہے ہیں تو سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ بڑے باکردار ہیں۔ پھر اس سے کوئی غرض نہیں رہ جاتی کہ معلوم کیا جائے کہ ان کے نظریات کیا ہیں، خیالات کیسے ہیں، ان کی زندگی کے معاملات کس نہج پر انجام پا رہے ہیں، دوسروں کے ساتھ ان کے تعلقات کی کیا نوعیت ہے۔ قومی شعور کتنا ہے اور قومی فرائض کو وہ کس حد تک نباہ رہے ہیں۔ کردار کا یہ تصور

نہایت ناقص ہے اور اس تصور کو ملتِ اسلامیہ کی زبوں حالی میں بڑا دخل ہے۔ قرآن مجید میں اور عقلِ انسانی میں اس تصور کی کوئی بنیاد نہیں۔

کردار اصل میں آدمی کے ایمان، عقائد اور نظریات سے بنتا ہے اور ان کا لازمی تقاضا ہوتا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ آپ کچھ زندہ عقائد و نظریات رکھتے ہوں، وہ آپ کے باطن سے ابھرتے ہوں، آپ کو ان کا شعور بھی ہو اور پھر ان کا اثر آپ کے کردار پر نمایاں نہ ہو۔ اسلام کے حوالے سے اسی بات کو یوں بھی کہا جاتا ہے کہ ایمان اور اسلام منفک نہیں ہو سکتے۔ ایمان آدمی کے عقائد و نظریات کو ظاہر کرتا ہے اور اسلام ان عقائد و نظریات کے عملی اظہار کا نام ہے۔ اگر ایمان کا دعویٰ موجود ہے اور اسلام نہیں پایا جاتا تو یہ دعویٰ جھوٹا ہے۔ ایسے لوگ زبان کے غازی اور دو رخے کے مجنوں ہوتے ہیں۔ صحیح کردار وہ ہے جس میں دونوں چیزیں ساتھ ساتھ پائی جائیں۔ پس قوموں کا جو کردار بنتا ہے وہ حقیقت میں ان کے باطن کا مظہر اور عکس ہوتا ہے۔

دوسری چیز جو یاد رکھنے کی ہے یہ ہے کہ کردار جس طرح انفرادی زندگی سے تعلق رکھتا ہے اسی طرح اجتماعی زندگی سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ قوم کی سربلندی کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ کا کردار نہ صرف آپ کی انفرادی زندگی میں ــــ مسجد میں، مکتب میں، گھر میں ــــ محسوس ہو بلکہ قومی زندگی کے ہر شعبہ میں ــــ معاشرت میں، سیاست میں، معاش میں، معیشت میں، حکومت میں، اقتدار میں، ہر جگہ نمایاں ہو۔ اگر اجتماعی معاملات میں قوم کا ہر فرد خود غرض اور لیڈر ہے، وہ ہر جگہ ہر حالت میں اپنا مطلب نکالنا چاہتا ہے، اس کو اپنے مفادات اس قدر عزیز ہیں کہ قومی مفادات کو قربان کر کے بھی اپنا مفاد حاصل کرنا چاہتا ہے، ہر قیمت پر اقتدار حاصل کرنے کا متمنی ہے تو ایسا شخص ذاتی لحاظ سے کتنا بھی نیک اور فرشتہ سیرت ہو، قومی کردار سے عاری ہوتا ہے۔ ایسے افراد سے بننے والی قوم خدا کے قانون کے مطابق ترقی نہیں کر سکتی بلکہ اس کا زندہ رہنا بھی محال ہے ؎

اگر ماند شبے ماند شبے دیگر نمی ماند

قومی زندگی کے لیے ضروری ہے کہ قومی کردار بھی اسی طرح مضبوط ہو جس طرح انفرادی کردار ہے۔ اس وقت ہمارا قومی المیہ یہ ہے کہ ہم اگر انفرادی کردار رکھتے بھی ہوں تو قومی کردار سے بالکل عاری ہوتے جا رہے ہیں۔

یہ نہ خیال کیجیے کہ ہمارا محض دعوائے ایمانی دوسری قوموں کے قومی کردار کا مقابلہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر قومی کردار کی اساس بہت مضبوط ایمان اور اخلاق پر نہ بھی ہو جب بھی یہ اپنا اثر دکھاتا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے ڈاکوؤں کے ایک جتھے پر قیاس کیجیے جس کی تنظیم بہت مضبوط ہو، لیڈر کی اپنی پارٹی پر گرفت پوری طرح ہو، ان کے اندر جاسوسوں کے گھسنے کا کوئی امکان نہ ہو، پارٹی مطمئن اور

اپنے مقصد کے لیے سردھڑ کی بازی لگانے والی ہو اور لیڈر اتنے ذی ہوش ہوں کہ ان کو مطمئن رکھنے کے لیے سیاست کے تقاضے پورے کرتے ہوں تو ڈاکوؤں کا یہ جتھا اپنے میدان میں لازماً کامیابیاں حاصل کرے گا۔ اس کے برعکس اگر کسی جماعت کے لیڈر بڑے اللہ والے ہوں لیکن کچھ قصے کہانیوں اور کچھ حکایتوں کے سوا انہیں کچھ آتا جاتا نہ ہو، دنیا کے معاملات کا انہیں شعور نہ ہو، تنظیم، تنظیم کے تقاضوں اور ضروریات کا انہیں کچھ علم نہ ہو، قومی زندگی کے مقتضیات اور مطالبات کے بارے میں کوئی واقفیت نہ رکھتے ہوں تو وہ ذاتی طور پر بہت نیک سہی لیکن اپنی جماعت کو کسی کامیابی سے ہمکنار نہیں کر سکتے۔

ہمارے ہاں ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اسلام کے اصولوں کی روشنی میں انفرادی کردار کے ساتھ ساتھ اجتماعی کردار کی آبیاری بھی کریں، ہماری تعلیم میں اجتماعیت کے تقاضے بتائے جائیں، دوسروں کے لیے ایثار و قربانی کا درس ملے۔ ملک و ملت کے معاملات میں محنت، نظم و ضبط، فداکاری، فرض شناسی اور قانون کی بالادستی کو اپنایا جائے۔ اگر ہم یہ شعور پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو ہماری قوم ترقی کر سکتی ہے اور ایک مضبوط حیثیت کی حامل بن سکتی ہے۔

(ترتیب : خالد مسعود)

از ص ۴۴ بقیہ : آدمی کا تعلق اپنے کنبہ اور بیوی بچوں کے ساتھ

مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ۚ إِنَّ أَنكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ ۝	اور اپنی آواز کو پست رکھ۔ بے شک سب سے زیادہ مکروہ آواز گدھے کی آواز ہے۔

(لقمٰن - ۳۱ : ۱۲ - ۱۹)

یہ لقمان، جہاں تک علم ہے، کوئی نبی نہیں تھے، بلکہ یہ عرب کے حکماء میں سے ایک جلیل القدر حکیم تھے اور غالباً ان کو ان کے علاقہ میں پدرسرانہ قسم کی سرداری بھی حاصل تھی۔ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بیٹے کو اس وقت یہ وصیت کی ہے جب ان کا وقتِ آخر ہوا ہے اور انہوں نے محسوس فرمایا ہے کہ اب ان کی ذمہ داریاں بیٹے کی طرف منتقل ہونے والی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ وصیت اتنی پسند آئی کہ یہ وحی الٰہی کا ایک حصہ بن کر زندۂ جاوید بن گئی۔

Dr. Munir Ahmed,
M. B. B. S., D. G. P.
96 ABU BAKAR BLOCK,
GARDEN TOWN, LAHORE. 16